رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۲۹۸

سب سے پہلا مشہور و معروف اخبار جس کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا ایک بازو قرار دیا

سلسلہ عالیہ احمدیہ کا

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

اخبار

الحکم

ہفتہ وار

قادیان

دور جدید

چندہ سالانہ
حکومت اور والیانِ ریاست سے ۲۰/-
امراء و رؤسا سے ۱۰/-
معاونین سے ۸/-
عوام " ۵/-
ممالک غیر سے ۱۲/-

مدینۃ المسیح قادیان دار الامان سے ہر انگریزی ماہ کی ۷۔۱۴۔۲۱۔۲۸ تاریخ کو خدا کے فضل سے شائع ہوتا ہے

قیمت فی پرچہ ۲/-

بانی عرفانی
شیخ یعقوب علی تراب احمدی عرفانی

مدیر مسئول
شیخ محمود احمد عرفانی مجاہد مصری

جلد ۴۱ مورخہ ۲۱/۲۸ اپریل و ۷/۱۴ مئی ۱۹۳۸ء مطابق ۲۰/۱۳ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ بروز یکشنبہ

نمبر ۱۲-۱۳-۱۴-۱۵

حضرت بھائی عبد الرحمٰن صاحب قادیانی

سابق

مہتہ ہریشچند صاحب کے اسلام قبول کرنے کے ایمان افروز حالات

جن میں

حضرت سیدنا مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پاکیزہ صحبت کے اثرات

Digitized by Khilafat Library Rabwah

اور

اسلام کی قوتِ قدسی اور نور کا تذکرہ کیا گیا ہے

نوٹ:- قارئینِ الحکم کی روحانی لذت اور مسرت کیلئے ان تمام حالات کو الحکم کے چار نمبروں کو یکجا جمع کر کے بڑی محنت سے شائع کیا گیا۔

(محمود احمد عرفانی)

اللہ بخش سٹیم پریس قادیان میں باہتمام شیخ محمود احمد عرفانی پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر اخبار "الحکم" تراب منزل قادیان سے شائع ہوا

انصارِ الحکم کا اپنا صفحہ

"الحکم" کو زندہ رکھنا ہر احمدی کا فرض ہے

اخبار "الحکم" سلسلہ عالیہ احمدیہ کا پہلا اخبار ہے۔ اسے سیدنا امامنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ملفوظات، مکتوبات اور تحریرات کے علاوہ خدا تعالیٰ کی تازہ وحی کے محفوظ کرنے کا فخر ملا۔ ان خدمات کو خدا کے اس پہلوانِ جلیل نے بارہا سراہا۔ اور پسند کیا۔ اور ان ناچیز خدمات کو مدنظر رکھ کر "الحکم" کو

اپنا بازو قرار دیا۔

پس الحکم اس پاک زمانہ کی یادگار ہے۔ اور آج پھر ذکر حبیب کی یاد میں رطب اللسان ہے۔ اسلئے میں ان تمام فدایانِ مسیحؑ اور محبانِ احمدؑ کو پکارتا ہوں۔ کہ وہ اٹھیں۔ اور اس اخبار کو جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانے کی یادگار ہے مضبوط چٹان پر کھڑا کر دیں۔ اسوقت مشکلات اور مالی تنگی کا وسیع طوفان چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اور اس کی زندگی خطرے میں نظر آتی ہے۔

اگر آپ کو اس اخبار سے کچھ بھی ہمدردی ہے۔ اور اگر آپ پسند کرتے ہیں۔ کہ اخبار جو مسیح موعود علیہ السلام کے پاک زمانہ کی یادگار ہے۔ کو جاری رکھا جائے۔ تو اس کا واحد علاج یہ ہے۔ کہ **اگر آپ** خریدار نہیں ہیں۔ تو اس اخبار کے خریدار ہو جائیں۔ اور اگر خریدار ہیں۔ تو پھر آپ کے ذمہ اگر کوئی بھی حساب باقی ہے۔ تو وہ آپ ادا فرمائیں۔ اگر یکمشت ادا نہیں کر سکتے تو دو تین اقساط میں ادا کر دیں

اور اگر آپ

خریدار بھی ہیں۔ اور آپ کے ذمہ کوئی بقایا بھی نہیں۔ تو پھر آپ اپنے دوستوں میں تحریک کر کے کم از کم ایک خریدار جو نقد قیمت ادا کر دے مہیا کر کے اجرِ عظیم کے مستحق ہوں۔

ایک نہایت رنجدہ انتقال

آہ! حافظ بشیر احمد مبلغ احمدیت

نہائت افسوس سے لکھا جاتا ہے۔ کہ سلسلہ عالیہ احمدیہ کے ایک ہونہار اور نہائت نیک اور پُرجوش مخلص مبلغ حافظ بشیر احمد صاحب مولوی فاضل و مبلغ سلسلہ عالیہ احمدیہ دفعتہً دماغ کی رگ کے پھٹ جانے سے فوت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحوم مغفور کی وفات ایک قومی صدمہ ہے۔ آپ جناب صوفی علی محمد صاحب کے اکلوتے بیٹے تھے۔ اور جناب خانصاحب مولوی فرزند علی خاں صاحب ناظر بیت المال کے ہمشیرہ زادے تھے۔

قادیان میں ہر ایک شخص نے اس خبر کو نہائت رنج اور دکھ سے سُنا۔ آپ کا جنازہ بعد نماز عصر باغ میں پڑھا گیا۔ جنازہ کے ساتھ بہت بڑا مجمع تھا۔ مرحوم مقبرہ بہشتی میں دفن کئے گئے۔

صوفی علی محمد صاحب نے اس صدمہ پر صبر کا بے نظیر نمونہ دکھایا۔ اللہ تعالیٰ ان کے قلب کو تسلی اور اطمینان دے۔ اور مرحوم کو جنت کے اعلیٰ مقام پر فائز کرے۔

حضرت خانصاحب حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ سندھ میں ہیں۔ ان کو اس ناگہانی خبر سے بڑا صدمہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اور اُن کے خاندان کے تمام ممبروں کو صبر جمیل عطا فرمائے

ھدیۂ تبریک

ہم معزز اور محترم ہمعصر جناب میر قاسم علی صاحب ایڈیٹر "فاروق" کو انکے نکاح کی تقریب پر جو رشید احمد خان صاحب پنشنر ہیڈ کانسٹیبل کی صاحبزادی رشیدہ بیگم صاحبہ کے ساتھ ۲ مئی ۳۸ء بعد نماز عصر حضرت مولوی سرور شاہ صاحب نے ایک ہزار روپیہ مہر پر پڑھا۔ ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ اس تعلق کو بابرکت فرمائے۔

خاندان حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضی میں

مسرّت افزا تقریب

حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ کے دوسرے صاحبزادے مولانا عبدالوہاب صاحب عمر کی تقریب رخصتانہ ۱۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو عمل میں آئی۔ برات حضرت خلیفۃ المسیح اوّل کے مکان سے چل کر جناب مفتی فضل الرحمٰن صاحب کے مکان پر ۵½ بجے آئی۔ مفتی صاحب نے مہمانوں کے لئے نواب صاحب کے مکان پر انتظام کیا گیا تھا۔ برات کے علاوہ مفتی صاحب نے بھی اپنے بہت سے احباب کو اس تقریب میں شامل ہونے کے لئے بلا رکھا تھا حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز بھی تشریف فرما تھے۔ دعا سے قبل احباب کی چائے اور فواکہات اور مٹھائی سے تواضع کی گئی۔ دعا کے بعد رخصتانہ کی تقریب عمل میں آئی۔

۱۵ اپریل ۳۸ء کو بعد نماز مغرب مدرسہ احمدیہ کے وسیع کمروں میں پانسو سے زائد مردوں کو دعوت ولیمہ دی گئی۔ اس دعوت میں خاص طور پر بہت سے باہر سے آنیوالے احباب کو بھی مدعو کیا گیا۔ جنمیں آنریبل ڈاکٹر سر محمد ظفر اللہ خاں کامرس ممبر آف گورنمنٹ انڈیا۔ اور جناب مولانا عبدالمجید صاحب سالک ایڈیٹر اخبار "انقلاب" لاہور بھی تھے۔ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ نے اس دعوت میں بھی بنفس نفیس شرکت فرمائی۔

ہم اس مبارک تقریب پر صدق دل سے دونو خاندانوں کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس تعلق کو ہر طرح بابرکت بنائے۔

تعاون کی ضرورت

ایک نوجوان جو موٹر ڈرائیوری کا کام جانتا ہے۔ عرصہ سے بیکار ہے۔ کوئی صاحب اگر ملازم رکھ سکتے ہوں یا ملازم کرا سکتے ہوں تو وہ اس کارِ ثواب میں تعاون فرما دیں۔

اطلاع بنام ایڈیٹر اخبار "الحکم" قادیان

مولوی صاحب

ایک مولوی صاحب جو پُرانی طرز کے مولوی ہیں۔ اور سلسلہ میں داخل ہیں عرصہ سے بیکار ہیں۔ اور بوجہ بیکاری شدید مالی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ ملازمت کے خواہشمند کوئی جماعت یا کوئی دوست ان کو اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے ملازم رکھنا چاہیں تو مجھے اطلاع دیں۔

محمود احمد عرفانی دفتر "الحکم" قادیان

"الحکم" کا آئندہ نمبر مسیح موعود نمبر ہوگا

الحکم کا ہمیشہ یہ طریق رہا ہے۔ کہ ۲۸ مئی کو جو حضورؑ کا یوم وصال ہے۔ ایک سیرت مسیح موعود نمبر شائع کیا کرتا ہے۔ اس سابقہ طریق کے مطابق امسال بھی ۲۸ مئی کو الحکم کا جو پرچہ شائع ہوگا وہ سیرت نمبر ہوگا۔ چونکہ الحکم کا عام حجم ۸ صفحے کا ہے۔ اس لئے یہ نمبر بھی دو نمبروں کا مجموعہ ہوگا یعنی ۲۱ و ۲۸ مئی کا۔ اسکے بعد انشاء اللہ حسب سابق ہر ہفتہ پرچہ شائع ہوتا ہے۔ محمود احمد عرفانی

ذکر حصولِ دولتِ ایمان وخلعتِ اسلام

صحابۂ حضرت مسیح موعود علیہ السلام

حضرت بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانی

حضرت بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانی ایک بلند پایۂ بزرگ ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کے سچے عاشق اور سلسلہ میں فدائیت کی رُوح رکھنے والے بےنفس بزرگ ہیں۔ آپ ہندوؤں سے مسلمان ہوئے تھے۔ آپ نے جناب مرزا برکت علی صاحب آف آبادان کے بار بار کے اصرار پر اپنے اسلام لانے کے حالات قلمبند فرمائے۔ اور میرے بار بار عرض کرنے پر یہ حالات مجھے پڑھنے کیلئے دیئے۔ جن پر میں نے قبضہ کرلیا۔ اور اُن کی مرضی کے خلاف محض اِس لئے اِس کو شائع کرتا ہوں۔ کہ ممکن ہے۔ کہ کوئی پیاسی رُوح اِس کے پڑھنے سے تسلّی پائے۔ اور اُسے اسلام کی طرف راہنمائی ہو۔ میں امید کرتا ہوں۔ کہ بھائی صاحب مجھے اِس جسارت اور جرأت پر معاف فرمائیں گے۔

بھائی جی نے اگرچہ مجھے اِس کے شائع کرنے کی اجازت نہیں دی۔ مگر میں اَب اِس چیز کو سلسلہ کی متاعِ خیال کرتا ہوں۔ اِس لیئے میں نے اِس کی جرأت کی ہے۔

"محمود احمد عرفانی"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

خدا کے فضل اور رحم کیساتھ

هُوَ النَّاصِر

استغفراللہ۔ استغفراللہ۔ استغفراللہ ربّی من کل ذنبٍ واتوب الیہ۔ لاحول ولاقوۃ الّا باللہ۔ لاحول ولاقوۃ الّا باللہ۔ لاحول ولاقوۃ الّا باللہ العلی العظیم۔

والدہ محترمہ نے جنم پتری کی رُو سے جو بکرمی سمّت و تاریخ بتائی اُس کی رُو سے میری پیدائش یکم جنوری ۱۸۷۹ء کو ہوئی۔ اور میں اپنے والدین کا پلوٹھا بیٹا بنا۔ کنجروڑ دتّاں تحصیل شکر گڑھ ضلع گورداسپور میری دادھیال مقام پیدائش ہے۔ میرے والد ماجد کا نام نامی اور اسمِ گرامی مہتہ گورا ندتہ مل اور والدہ مکرمہ معظمہ کا نام پاربتی دیوی ہے۔

میرے والد بزرگوار موہیال قوم کی موہن شاخ اور میری والدہ محترمہ موہیال قوم کی دتّ شاخ سے تھیں۔

میرے والد محترم کے دو اور بڑے بھائی تھے۔ جن میں سے بڑے کا نام مہتہ ہیمراج اور چھوٹے کا نام مہتہ لال چند تھا۔ اور میرے دادا بزرگوار کا نام نامی مہتہ ہیرا لال تھا۔

موہیال قوم سات مختلف موہیوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ جن کی تاریخی روایات نہائت ہی شاندار ہیں۔ کئی مبسوط کتب اِس قوم کے تاریخی حالات کی حامل ہیں۔ جن میں سے ایک مختصر سی کتاب "گلشن موہیالی" میں نے بھی ملکانہ وال کے زمانہ میں پڑھی تھی۔ کسی زمانہ میں یہ قوم ہندوستان۔ کشمیر۔ اور کابل تک پر حکومت کی مدّعی ہے۔ اور اپنی بہادری اور تیغ زنی کی روایات پر اُس کو بڑا فخر ہے۔ اور عرب یا عراق عرب اور یونان تک سے اپنے تعلقات بیان کرتی ہے۔ واللہ اعلم

والدہ ماجدہ سنایا کرتی تھیں۔ کہ میرے (راقم کے) آباؤ اجداد ممدوٹ (ضلع فیروزپور میں ایک ریاست ہے) سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اُن کو حکومت کے کاروبار میں بڑا دخل و تصرف تھا۔ اور اکثر ریاست کی مشینری کے بہترین پرزے اور نواب صاحب ممدوٹ کے معتمد تھے۔ خاندان میں سے کوئی تعلیم اسلام سے متأثر ہوگیا اور اُس نے اظہارِ اسلام کردیا۔ جس کی وجہ سے موہن قوم کے افراد نواب صاحب کے مخالف ہوگئے۔ اور جب باوجود مطالبہ واصرار نواب صاحب نے برضا و رغبت مسلمان ہونے والے کو اُن کے حوالے نہ کیا۔ بلکہ اُس کی حمائت وامداد کی۔ تو ساری موہن قوم نواب صاحب کے خلاف برسرِ پیکار ہوگئی۔ اور پھر تلوار کو نیام میں نہ کیا جب تک کہ ایک ایک کرکے نواب صاحب کی افواجِ قاہرہ کی تلوار کا لقمہ نہ بن گئے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ بعض بڈھے بچے اور مستورات کے سوا کوئی باقی نہ بچا۔ اور جو بچا۔ اُس نے ترکِ وطن کیا۔ اور کنجروڑ میں آکر اپنی دتّ برادری کے پاس بود و باش اختیار کرلی۔

میں ابھی چالیس دن کا بھی نہ ہوا تھا۔ کہ میری والدہ کو اپنے والد صاحب چوہدری گوپال داس صاحب کے پاس مٹھا چک تحصیل پھالیہ ضلع گجرات میں جانا پڑا۔ اور پھر وہیں میری ابتدائی پرورش ہوئی۔

جس حصّہ گاؤں میں میرے نانا رہتے تھے۔ (وہ اس حلقہ کے پٹواری مال تھے) اس میں دو تین گھرانے شریف زمیندار مسلمان بھی رہتے تھے۔ گرمی کے موسم میں ایک رات جبکہ والدہ محترمہ بےخبر سوتی تھیں میں چارپائی سے نیچے گرا۔ اور رو یا کیا۔ مگر والدہ کی نیند نہ کھلی۔ ایک مسلمان معمّر عورت مریم نام جسے محلہ والے ماں مریاں (مریم) کرکے پکارتے اٹھیں اور انہوں نے مجھے محبّت سے گود میں لیا۔ اور باقی رات مجھے نہائت محبت ومہربانی سے اپنی چھاتی سے لگائے رکھا۔ والدہ محترمہ کو جب ہوش آیا۔ تو گھبرائیں۔ اور رونے لگیں۔ مگر ماں مریم نے اُن کی تسلّی مجھے دکھا کر کرائی۔ اور والدہ کو نصیحت کی۔ مگر اُسی دن سے ماں مریم کو مجھ سے کچھ ایسی محبّت ہوگئی۔ کہ وہ مجھے رات کو بھی جُدا نہ کرتیں۔ اور اکثر روزانہ مجھے گودی میں لے کر قرآن کریم کی تلاوت فرمایا کرتیں۔

اس زمانہ میں ہندو مسلم تعلقات برادرانہ ہُوا کرتے تھے۔ اور بھائی بندوں کی طرح ہندو مسلمان ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ میں محترمہ ماں مریم ہی کی گودیوں میں قرآن کریم سنتے سنتے پلا اور بڑھا۔ اکثر وہیں کھاپی بھی لیا کرتا تھا۔ کیونکہ اُس زمانہ میں چھوت کا بھی چنداں رواج نہ تھا۔

جب ہوش سنبھالا اور چار پانچ برس کا ہوگیا۔ تب میرے نانا صاحب بزرگوار نے مجھے تعلیم کی غرض سے جکالیاں (جو تحصیل پھالیہ میں ایک قصبہ ہے۔ اور مٹھا چک سے غالباً تین میل کے فاصلہ پر ہوگا) کے مدرسہ میں داخل کرادیا۔ جہاں روزانہ میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ جاتا۔ روٹی گھر سے پکوا کرلے جاتا۔ اور بھوک لگتی تو وہیں کھا لیا کرتا۔ اور شام کو رخصت ہوتی تو واپس گھر آجایا کرتا۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرے عادات کو جو مسلمان ماں مریم کی صحبت کی وجہ سے اِسلامی رنگ میں ڈھلتے جارہے تھے۔ نانا صاحب نے بدلنے کی پوری کوشش کی ہوگی۔ کیونکہ سکول کی ابتدائی زندگی کا ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ کہ ایک روز ایک مسلمان لڑکا مجھ سے چُھو گیا۔ جبکہ میرے ہاتھ میں میرا کھانا تھا۔ میں نے وہ کھانا پھینک دیا۔ اور دن بھر بھوکا رو تا رہا۔ مجھے یاد پڑتا ہے۔ کہ وہ چھوئی ہوئی خوراک میرے کسی ہندو ساتھی نے اٹھا کر رکھ لی۔ اور جب وہ کھانے بیٹھے۔ تو مجھے بھی میری روٹی کھا لینے کو کہا۔ بلکہ اصرار بھی کیا۔ اور مجھے تسلّی دلائی۔ کہ کچھ ہرج نہیں اور ہم کسی کو بتلائیں گے بھی نہیں۔ وغیرہ۔ مگر میں نے اُس کے کھانے سے انکار پر اصرار کیا۔ اور کہا کہ

بھرشٹ چیز کے کھانے سے موت بھلی لگتی ہے۔ چنانچہ موسم گرما کا لمبا دن پانچ چھ سال کی عمر میں نے پانی پی پی کر کاٹ دیا۔ جب بھوک ستاتی، مدرسہ کے قریب ہی ایک رہٹ والا کنوآں چلتا تھا۔ جاتا اور پانی پی کر پیٹ بھر لیتا۔

ملکی رواج کے مطابق میرے ماں باپ نے بھی اظہارِ محبّت والفت کی غرض سے میرے کان چھدوا رکھے تھے۔ اور ہر ایک کان میں تین سوراخ کرا کے بالیاں اور ہاتھ پاؤں میں جھنجھنے دار کڑے اور پاؤنٹے پہنا رکھے تھے۔

بار بار کنوئیں پر آتے جاتے دیکھ کر کسی سنگدل کو حرص و طمع کی آگ لگی۔ اور ایک مرتبہ جبکہ شدّتِ گرما کی وجہ سے ہُو کا عالم تھا۔ اور ہر طرف سنّاٹا تھا۔ مجھے بھوک بار بار ستاتی اور میں پانی کی طرف دوڑتا۔ اس مرتبہ جو میں گیا۔ تو رہٹ چلانے والے نے موقعہ پاکر اِدھر اُدھر دیکھ کر پانی پینے کے گلے میں ایک کپڑا ڈال کر کھینچتے گھسیٹتے ایک گڑھیال کے اندر جا پٹکا۔ اور میرے سینے پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ میرے گلے کی ہنسلی نہایت بے رحمی سے کھینچکر اتاری۔ اور جب درد سے میری چیخیں نکلیں۔ تو اُس نے میرا گلا ایسا دبایا۔ کہ میری آنکھیں باہر نکلنے کو آئیں۔ اور میرا دم ایسا گھٹا۔ کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ نہ معلوم پھر کیا ہوا۔ ہنسلی اور ایک کڑا ہوش آنے پر میرے ساتھ میں نے نہ پایا۔ اور وہ آدمی بھی پھر میں نے نہ دیکھا۔ میں ایسا سہما ہوا تھا۔ کہ ہوش آتے ہی پاؤں سر پر رکھ کر بھاگا۔ اور سکول جاکر کسی کو نہ بتایا۔ کہ ماجرا کیا ہے۔ البتہ لڑکوں نے میرا حال دیکھ کر اور زیور اُترے ہوئے دیکھ کر ماسٹر صاحب سے کہا۔ انہوں نے مجھ سے ماجرا پوچھا۔ جو میں نے عن و من سنایا۔ وہ کنوئیں پر گئے۔ اِدھر اُدھر پوچھا۔ مگر انہوں نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔ اور کہدیا۔ کہ یہ لڑکا تو ہمارے کنوئیں پر آیا ہی نہیں۔ ہم نے تو اب دیکھا ہے۔ پہلے اس کی شکل تک کے آشنا نہیں۔

شام کو جب گھر پہنچا۔ نانا صاحب کو حال معلوم ہوا۔ انہوں نے بھی موقعہ پر پہنچ کر دریافت کیا۔ مگر کون اقرار کرتا۔ آخر جان بچی لاکھوں پائے صبر کیا، اور سبق سیکھا اُس دن سے میرے زیور سب اتار دیئے گئے۔ اور مجھے یاد نہیں کہ پھر میری شادی کے ایّام کے سوا کبھی پہنائے گئے ہوں۔ میرے کانوں کے چھ چھیدوں میں سے چار تو آج بتاریخ ۲۸/۳ تک موجود ہیں۔ اور یہ تو امید ہے۔ کہ قبر میں بھی میرا ساتھ دیں گے۔ باقی دو جو کان کے نچلے نرم اور گوشت دار حصہ میں تھے گو مندمل ہو چکے ہیں۔ مگر نشان اُن کے بھی زندگی بھر جانے والے نہیں۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس لالچی سفاک کو کوئی کھٹکا ہوا۔ جبکہ ہنسلی اتارنے کی وجہ سے میری بلبلاہٹ نکلی۔ کوئی اِدھر کو آتا ہوگا۔ جس کی وجہ سے وہ سنگدل جو ہاتھ آیا۔ اُسی کو غنیمت جان کر بھاگ نکلا۔ بہرحال یہ ایک ایسا سبق تھا۔ جو میرے سرپرستوں کے بھی کام آیا۔ اور میرے لئے بھی خضرِ راہ بنا۔

اُسی زمانہ میں مجھے اپنی والدہ محترمہ کے ہمراہ پاکپٹن جانا پڑا۔ جہاں میرے والد بزرگوار بسلسلہ ملازمت سکونت پذیر تھے۔ چکالیاں میں بھی ابھی میری تعلیم کے بالکل ہی ابتدائی ایّام تھے۔ نئی جگہ اور نئے حالات کے باعث پاکپٹن میں مَیں سکول نہ جاسکا۔ اور اس کا باعث وہ صدمہ بھی تھا۔ جو والدہ کو میرے زیورات کے واقعہ کے باعث ابھی ابھی پہنچ چکا تھا۔ وہ مجھے آنکھوں سے اوجھل کرنا پسند ہی نہ کرتی تھیں۔ اسطرح یہ دن ناز و ادا کی وجہ سے کھیل کود میں گذرتے اور پڑھنا تو درکنار پچھلا آموختہ بھی بھول گیا۔

پاکپٹن میں ہمارا قیام چند ماہ سے زیادہ نہ ہوا۔ اِس جگہ کے تین واقعات میں سے دو تو مجھے بھی یاد آجایا کرتے ہیں۔ جن میں سے ایک تو یہ ہوا۔ کہ مکان کی چھت سے گر کر میری ایک ٹانگ ٹوٹ گئی جسکی وجہ سے والدہ محترمہ کو سخت تکلیف اٹھانا پڑی۔ آخر اللہ پاک نے رحم فرمایا اور ٹانگ اچھی ہوگئی۔ تو ایک روز محترمہ والدہ ماجدہ کے ہمراہ کسی تالاب پر نہانے کو چلا گیا۔ جہاں عورتوں کے نہانے کو الگ ایک پردہ دار چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی عورتوں اور جوان لڑکیوں کو بے تکلّفانہ نہاتے دیکھ کر میں نے بھی بے دھڑک چھلانگ لگائی۔ اور پانی چونکہ بہت گہرا تھا۔ نیچے ہی بیٹھ گیا۔ جب عورتوں کی چیخ پکار سے کچھ بن نہ آیا۔ تو اُن کے واویلا پر کوئی مرد آئے۔ جنہوں نے مجھے نیم جان باہر نکالا۔ اور اسطرح محض خدا کے فضل سے پھر سے نئی زندگی ملی۔

تیسرا واقعہ مجھے یاد نہیں۔ مگر جنابہ والدہ صاحبہ اُسے ہمیشہ دہرایا کرتیں تھیں۔ خصوصاً میرے اسلام لانے کے بعد جب بھی تشریف لاتیں۔ ایک سرد آہ بھر کر فرمایا کرتیں "لچھمن تو پہلے ہی سے ایسے تھے۔ مگر افسوس ہم نے سمجھا نہیں تھا۔" وہ فرمایا کرتی تھیں۔ کہ "قیام پاکپٹن میں ایک روز میں بھی محلہ کی عورتوں کے ساتھ تمہیں (راقم کو) انگلی لگائے بابے کی خانقاہ میں سلام کو چلی گئی۔ جدھر جدھر دوسری عورتیں جاتیں۔ مَیں بھی ساتھ ساتھ جاتی۔ اور جہاں بڑی بوڑھیاں سلام کرتیں سیس نواتیں میں بھی عقیدت سے سر نیچا کرتی۔ اور سلام کر کے چڑھاوا چڑھاتی۔

ایک جگہ ایک سفید ریش سبز عمامہ پوش بیٹھا تھا۔ وہاں بھی سب نے سلام کیا۔ اور میں بھی سلامی ہوئی۔ جب ہم سب عورتیں وہاں سے جانے لگیں۔ اور میں چونکہ بڑی بوڑھیوں کے پیچھے پیچھے رہتی تھی۔ میں بھی اُٹھی اور تمہارا (راقم کا) ہاتھ پکڑ کر چلنے کو تھی۔ کہ اُس سفید ریش بزرگ نے روکا۔ اور تمہیں (راقم کو) اپنی طرف بلایا۔ مگر میں نے گھبرا کر تمہارا ہاتھ مضبوط پکڑ لیا۔ اور پھر چلنے لگی۔ کیونکہ میری ساتھی عورتیں چند قدم آگے چل چکی تھیں۔

جب اس سبز عمامہ پوش سفید ریش بزرگ نے دیکھا۔ کہ میں تمہیں (راقم کو) اس کی طرف جانے سے روکتی ہوں۔ تو جوش میں بھرے ہوئے آواز سے بولے۔ "بیٹی! یہ بچہ ہمارا ہے۔ بہتر ہے۔ خوشی سے ہمیں دیدو۔ اس کی پیشانی میں ایک ایسی چیز ہے۔ جو تمہارے کام کی نہیں۔ مان لو۔ تو بھلا ہوگا۔ ورنہ پچھتاؤ گی"۔ واللہ اعلم (یہ ان الفاظ کا خلاصہ ہے میرے لفظوں میں جو وہ اپنی زبان میں فرمایا کرتی تھیں)

والدہ فرمایا کرتی تھیں۔ کہ میں کانپ اٹھی۔ اور بجائے انگلی لگانے کے جلدی سے گودی میں اٹھا کر وہاں سے ایسی بھاگی کہ ساتھی عورتوں کا بھی مجھے خیال نہ رہا۔ اور پھر میں کبھی بھی اُس خانقاہ میں نہ گئی۔

پاکپٹن کے بعد میں کسی لمبے اور جنگلی سفر کی یاد تو دماغ میں پاتا ہوں مگر نہیں کہہ سکتا کہ کس ضرورت اور حاجت یا انقلاب کے ماتحت وہ سفر میرے والدین کو پیش آیا۔ جس میں مَیں اُن کے ہمراہ تھا۔ مگر اتنا دل پر اثر ہے۔ کہ کوئی مشکلات ضرور تھیں جن کی وجہ سے وہ سفر اچانک ہمیں کرنا پڑا۔

اِس سفر کے نتیجہ میں جہاں تک مجھے یاد ہے۔ میں اپنے والدین کے زیر سایہ تحصیل چونیاں ضلع لاہور کے بعض دیہات میں رہنے لگا۔ جو بعض سکھ سرداروں کی ملکیّت تھے۔ (دیر سنگھ والا۔ بھاگو والا۔ گجن سنگھ والا ٹبّی وغیرہ وغیرہ دیہات) اور وہاں میرے والد محترم مختار عام کی حیثیت سے ملازم تھے۔

اس زمانہ میں میرے والد صاحب نے میری تعلیم کا انتظام ایک مقامی پنڈت کی زیر نگرانی کیا۔ جس نے مجھے ہندی تعلیم نوشت وخواند کے ساتھ ساتھ بعض بعض وید منتر زبانی بھی یاد کرانے شروع کر دیئے۔ اور میری زبان کی صفائی اور روانی کی وجہ سے زیادہ تر توجہ استاد صاحب کی زبانی تعلیم پر ہی مبذول ہوگئی۔ اور اس طرح بہت سے وید منتر مجھے یاد ہو گئے۔ جو عام طور پر سکھ سردار اور بڑے بوڑھے شغل کے طور پر مجھ سے سُن کر خوش ہوا کرتے تھے۔

اُسی زمانہ کا ایک واقعہ اللہ پاک کی قدرت کا کرشمہ مجھے یوں یاد ہے۔ کہ:۔

ایک روز میرے والد صاحب نے تالاب کنارے کے سایہ دار درختوں کے نیچے (جہاں عام طور سے دیہاتی لوگ دوپہر کے وقت گھروں سے چارپائیاں لیجا کر سویا کرتے تھے) سے مجھے گھر سے اپنا نیا جوتا لانے کا حکم دیا۔ اور نشان و پتہ بتلایا۔ کہ وہ جوتا کہاں رکھا

ہے۔ کیونکہ گھر میں والد صاحب کے دو جوتے رکھے تھے۔

میں تعمیل ارشاد میں گھر پہنچا۔ والدہ محترمہ صحن میں دیوار کے سایہ تلے کسی کام میں مصروف تھیں۔ میں سیدھا اندر چلا گیا۔ مگر مصلحت الٰہی اور منشاءِ ایزدی نے میرے دماغ سے مقررہ جوتا اٹھانے کا خیال نکالدیا اور میں بجائے پہلے طاقچہ والے جوتے کو اٹھانے کے کمرہ کے انتہائی گوشہ کے طاقچہ کی طرف چلا گیا۔ جہاں دوسرا جوڑا رکھا ہؤا تھا۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ سبحان ذی الملک والملکوت والعزۃ و العظمۃ والھیبت والقدرۃ والکبریاء والجبروت۔

میرا اس کونہ میں پہنچنا تھا۔ کہ یکدم سارے مکان کی چھت بیٹھ گئی۔ اور دھڑام کی آواز کی گونج سے محلہ بھر میں سناٹا چھا گیا۔ اور اتنا گرد و غبار اٹھا۔ جیسے بیسیوں آندھیاں اسی حلقہ میں جمع ہو گئی ہوں۔

اس دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی ایک دردبھری چیخ بلند ہوئی۔ اور آن کی آن میں گاؤں بھر کے مرد عورت بچے بوڑھے آہ و بکا کی پکار کی طرف جمع ہو گئے۔

ماں کی ماںتا نے میری محسن ماں کو اپنی جان کے خطرہ سے ایک منٹ کے لئے بالکل غافل کر دیا۔ اور وہ بےتابانہ ہریشچندر ہریشچندر پکارتی گرتی ہوئی چھت اور دیواروں کے اندر گھسی چلی گئیں۔ اور قدرت نے بھی اُن کی غیر معمولی طور سے مدد فرمائی۔ کہ وہ ہاتھ پاؤں مارتی گرد و غبار کو چیرتی ہوئی مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں۔ جہاں نہائت ہی سہمی ہوئی آواز میں مَیں نے اُن کی پکار کے جواب میں جی کہا۔ وہ میری آواز پر بڑھیں۔ اور مجھ سے لپٹ کر بے ہوش ہو گئیں۔

سینکڑوں لوگ جمع تھے۔ اور وہ حیران تھے۔ کہ دھماکے کے ساتھ ہی نکلنے والی چیخ کس کی تھی۔ اگر عورت کی تھی۔ تو وہ ہے کہاں۔ جان کے خطرہ سے کوئی اندر گھسنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ ایک دوسرے کو اور دوسرا تیسرے کو آگے بڑھنے کو کہتا۔ مگر سوائے ایک مرد کے کوئی آگے نہ بڑھا۔ جو دور سے بھاگنے آنے کی وجہ سے اتنا ہانپ رہا تھا۔ کہ دم کھال میں نہ سماتا تھا۔ وہ بے تحاشہ بڑھا اور پکارنے لگا۔ ہریشچندر! ہریشچندر!

مَیں اَب سنبھل چکا تھا۔ مگر والدہ بے ہوش تھیں مَیں نے آواز کا جواب دیا۔ والد صاحب کو تسلّی ہوئی۔ اور وہ مجھ تک پہنچ کر والدہ سمیت زندہ سلامت باہر لے آنے میں کامیاب ہو گئے۔ والدہ محترمہ کے مونہہ پر پانی کے چھینٹے مار مار کر اور حلق میں پانی ڈال ڈال کر اُن کو ہوش میں لانے کی کوشش کی گئی۔ جو چند منٹ میں سنبھل گئیں۔ اور چاروں طرف سے مبارک مبارک کی آوازیں آنے لگیں۔

مَیں اگر مقررہ جوتا اٹھانے کھڑا ہو جاتا۔ تو وہ ایسا موقعہ تھا۔ کہ ٹوٹ کر گرنے والا شہتیر یقیناً میرے سَر پر پڑتا جس سے جانبر ہونا ناممکن تھا۔ لہٰذا مشیّت ایزدی نے میرے دماغ سے اُس کا خیال نکال کر میری توجہ دوسرے جوتے کی طرف پھیر دی۔ جو مکان کے شمال مشرقی کونہ میں رکھا تھا۔ خدا کی شان کہ جہاں میں کھڑا تھا۔ وہاں صرف چند فٹ چھت نہ معلوم کس سہارے پر کھڑی رہ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ خدا نے ہاتھ دے کر بچا لیا تھا۔

نہیں معلوم کہ اسی واقعہ سے متاثر ہو کر یا بعض اور تحریکات کے ماتحت والد صاحب کا خیال میری تعلیم کے متعلق تبدیل ہو گیا۔ اور انہوں نے مجھے چونیاں کے سکول میں جوان مواضعات سے آٹھ دس میل کے فاصلہ پر تھا داخل کرا دیا۔ اور میری رہائش کا انتظام اپنی ایک ہم قوم چچی صاحبہ کے پاس کیا۔ جو کہ اپنے بڑھاپے اور بیوگی کے ایام نہائت صبر اور محنت و مشقت میں کاٹ رہی تھیں۔

چونیاں لاہور کے ضلع کی ایک مشہور تحصیل اور بہت پُرانا شہر ہے۔ اِس کے ارد گرد پُرانے کھنڈرات میلوں تک چلے جاتے ہیں۔ اور سُنا ہے۔ کہ کسی زمانہ میں دریائے ستلج و بیاس دونو مِلکر اِس کے نیچے بہتے تھے۔

میرے خیالات بدستور ہندوانہ تھے۔ دیوی دیوتاؤں کی پوجا پاٹھ اور شوالے مندروں میں جا کر گھنٹے بجانا، جگ راتے اور آرتیوں میں شریک ہونا میرا کام تھا۔ سکول کو جاتے ہوئے اور واپسی پر دیوی دوارہ یا جو مندر راستہ میں پڑتا سر جھکا کر ماتھا ٹیکے بغیر یا پرارتھنا کئے بغیر میں ہرگز نہ گذرتا۔ اور اس کو میں نیکی اور سعادت کا موجب یقین کیا کرتا تھا۔

مجھے خوب یاد ہے۔ کہ میں اپنی قومی رسوم کا نہائت سختی سے پابند تھا۔ اور خوشی سے اُن کی پابندی کیا کرتا تھا۔ خواہ کتنی بھی مجھے تکلیف کیوں نہ ہو۔ میں ہر قسم کے برت رکھتا اور دیانت داری سے ان کو نبھاتا تھا۔ حتّٰی کہ بعض قسم کے برت اسلامی روزہ سے بھی زیادہ لمبے ہؤا کرتے تھے۔ وہ بھی میں رکھتا تھا۔

ہماری قومی رسم کے مطابق گنّا کھانا ایک خاص وقت (غالباً اسوج کے آخر یا کاتک کے شروع تک) تک ممنوع تھا۔ اور خاص پابندی تھی۔ کہ جب تک مقررہ دن باقاعدہ دیوی دیوتا کے سامنے اپنے جسم کا خون بطور بھینٹ نہ چڑھا لیتے گنّا نہ کھایا جاتا تھا میں باوجود بچپن کے صبر کرتا۔ اور اس رسم کو خوشی خوشی ادا کرنے کے بعد گنا کھانے کا نام لیتا۔ دیوی دیوتا کے سامنے نہائت عقیدت اور شوق سے اپنے جسم کا خون گراتا۔ اور اس میں حوصلہ اور برداشت کا غیر معمولی نمونہ دکھایا کرتا۔ جس سے عموماً مجھ سے بڑے بھی گھبرایا کرتے تھے۔

میں عموماً سردی و گرمی میں سویرے اٹھتا۔ اور غسل کے لئے تالاب پر جایا کرتا۔ اور وہ وید منتر (جو دیہاتی زندگی میں مجھے میرے پنڈت استاد نے یاد کرائے تھے۔ اور موجودہ عمر اور مذہبی خیال کی وادی کی تربیت کے باعث وہ روح مجھ میں قائم تھی۔) پڑھ پڑھ کر پوجا پاٹھ اور پرارتھنا کیا کرتا تھا۔

یہ اس زمانہ کے حالات ہیں۔ جبکہ میری عمر نو دس یا گیارہ سال کی تھی۔ یعنی ۱۸۸۷ء و ۱۸۸۸ء یا ۱۸۸۹ء کے زمانہ کے آس پاس۔

انہی ایام کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ کہ میرے بعض بڑے بھائیوں اور چچا وغیرہ نے جو رشتہ داروں میں سے تھے۔ ایک دن یہ منصوبہ کیا۔ کہ ہریشچندر حقہ نہیں پیتا۔ جس کی وجہ سے اسے چلم کا بھرنا اور سلگانا بھی نہیں آتا۔ اور اِسطرح یہ بڑوں کی خدمت بھی نہیں کر سکتا۔ آؤ اسے حقّہ پلا کر حقّہ کا عادی بنائیں تاکہ یہ بڑوں کی خدمت تو کر سکے۔

سب نے مِل کر حقّہ تیار کیا۔ اور مجھے درمیان میں لے کر بیٹھ گئے۔ باری باری کش لگاتے۔ جب میری باری آئی تو مجھے بھی مجبور کیا۔ کہ کش لگاؤں۔ میں نے انکار کیا۔ مگر انہوں نے اصرار کیا۔ اور ناراضگی کی دھمکی اور ناصحانہ رنگ سے مجھے آمادہ کر لیا۔ کہ میں بھی کش لگاؤں۔

میں عادی نہ تھا۔ اور مجھے یہ بھی علم نہ تھا۔ کہ کش کِس طرح لگاتے ہیں۔ آخر اُن کے مجبور کرنے پر میں نے ایک لمبا سُوٹا لگا لیا۔ سوٹا لگانا تھا۔ کہ میری آنکھیں پھر گئیں۔ سر میں چکر آ گئے۔ اور متلی ہو کر میں بیدل ہو گیا۔ اور ہوتے ہوتے تکلیف اتنی بڑھی۔ کہ بے ہوشی تک نوبت پہنچ گئی۔ میرا یہ حال دیکھ کر میرے بھائی بند اپنے کئے پر پشیمان ہوئے اور انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ اور مجھے یہ کہتے ہوئے ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیا۔ کہ

"چھوڑو اسے یہ ہمارے کام کا نہیں"۔

اسی زمانہ کا ایک اور تکلیف دہ واقعہ مجھے یاد ہے۔ وہ یہ کہ ایک روز دیرسنگھ والا میں میری ایک خالہ مجھ سے ہنسی کر رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر چکر دیا۔ جس کے نتیجہ میں میری ایک جُن ران میں شدید درد ہو گیا۔ اور بڑھتے بڑھتے ایسا بڑھا۔ کہ میں اٹھنے بیٹھنے تک سے رہ گیا۔ اور آخر نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ گنٹھیر ہو گیا جس کی وجہ سے میں کئی ماہ تک خطرناک اور ناقابل برداشت دردوں کا شکار بنا رہا۔ اور میرے والدین کو میری اِس تکلیف کے باعث سخت مشکلات اور تکالیف کا سامنا ہؤا سینکڑوں روپے علاج معالجہ پر صرف کئے مگر کوئی فائدہ نہ ہؤا۔ جا بجا علاج کے لئے مجھے اٹھائے لئے پھرتے۔

مجھے یاد ہے۔ اور میری آنکھیں آج بھی دیکھ رہی ہیں۔ کہ بعض اوقات میرے والد بزرگوار مجھے اپنے کندھوں پر اٹھائے میلوں میل لے جایا کرتے تھے۔ ان احسانات کا خیال دل میں ایک جوشِ دعا پیدا کرتا ہے۔ مگر کیا کروں۔ اُن سے بھی زیادہ محسن اور شفیق کا حکم کچھ اور ہے۔ آخر عرصہ تقریباً ایک سال بعد ایک مقامی جراح کے علاج سے (جو بصورت لیپ وغیرہ تھا۔ اور نہائت ہی غلیظ اور بدبودار چیزوں کا لیپ تھا) خدا نے اس گنبھیر کو اندر ہی اندر معدوم کر دیا۔ اور ایسا فضل کیا۔ کہ اب تو مدتوں سے مجھے یہ بھی یاد نہیں۔ کہ وہ تکلیف ہوئی کس مُنِ ران میں تھی۔ الحمدللہ، الحمدللہ، ثم الحمدللہ

اِن سفروں اور نقل مکانی وغیرہ میں میرے دو تین سال ضائع ہو گئے تھے۔ مگر اب میرے والد صاحب نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ کچھ ہو کہیں جائیں مجھے بہر حال چونیاں کے سکول ہی میں رکھیں گے۔ چنانچہ پھر میں ۱۸۹۵ء کی جنوری یا فروری تک متواتر اُسی سکول میں پڑھتا رہا۔ پہلے دادی صاحبہ کے زیر سایہ اور بعد میں مکرمہ والدہ صاحبہ کی زیر نگرانی۔ اِس عرصہ میں ایک زمانہ ایسا بھی آیا۔ کہ جناب والد صاحب کسی سادھو کی صحبت میں رہنے کے باعث اس کے ایسے گرویدہ ہو گئے کہ ملازمت ترک کر کے اُس کے ساتھ ہو لئے۔ اور دور کہیں گوالیار کے پہاڑوں اور جنگلوں میں اور کہیں ہمالیہ اور بندھیاچل کی چوٹیوں پر بعض جڑی بوٹیوں کی تلاش میں ایسے سرگردان رہے۔ کہ دو تین سال تک اُن کا کوئی پتہ نہ چلا۔ اور والدہ محترمہ نے گھر کا اندوختہ اور ضروریات تک اٹھا اٹھا کر ہماری پرورش کی۔

اسی زمانہ کی ایک یاد آج تک میرے دل میں تازہ ہے۔ کہ مجھے والد صاحب کی گمنامی کا علم ہو گیا (والدہ محترمہ نے باوجود تکلیف اور تنگی کے ہمیں اس بات کا علم نہ ہونے دیا تھا) تو میں نے اپنی مہربان والدہ صاحبہ سے عرض کیا۔ کہ آپ تسلی رکھیں۔ گھبرائیں نہیں۔ میں نے خط لکھنا تو سیکھ لیا ہے۔ اب سکول کو چھوڑتا ہوں۔ اور محنت مزدوری کر کے جو کچھ حاصل کر سکوں گا۔ آپ کی خدمت میں حاضر کر دیا کروں گا۔ آپ میرے بھائی بہنوں کی اچھی طرح سے پرورش کریں۔ اور ان کو اچھی تعلیم دلائیں۔

مجھے یاد ہے۔ کہ میری والدہ صاحبہ پر میرے ان الفاظ کا ایسا اثر ہوا۔ کہ وہ مجھے چھاتی سے لگا کر زارو قطار رونے لگیں۔ اور مجھے تسلی دی کہ نہیں تمہارے ابا کا خط آگیا ہے۔ وہ جلد آتے ہیں۔

خدا کی شان کہ والدہ نے تو محض میری تسلی کے لئے یہ کہا تھا۔ مگر چند ہی روز گذرے ہونگے۔ کہ والد صاحب کی طرف سے خط اور خرچ آگیا۔ اور ساتھ ہی اطلاع آگئی۔ کہ وہ خود بھی جلدی آرہے ہیں۔ چنانچہ جب وہ تشریف لائے۔ تو اُن کے خیالات مہوسانہ تھے۔ سینکڑوں روپیہ گھر پر آکر بھی انہوں نے دوائی دارو اور نسخہ جات کیمیا کی نذر کر دیا۔ اور سیکھا تو صرف یہ کہ گندھک اور پارہ کا گلاس بنا لیا کرتے تھے۔ اور بس آخر تنگ آکر اِن چیزوں کو چھوڑا۔ اور پھر ملازمت کا سلسلہ شروع کیا۔ اور پٹوار مال محکمہ سرکار میں حاصل کر لی۔

مَیں سکول میں تیسری جماعت پاس کر کے چوتھی میں گیا تھا۔ یا کہ چوتھی کے بعد پانچویں میں (کچھ ٹھیک یاد نہیں) اس زمانہ میں جماعت کے کورس میں (ٹیکسٹ بک) ایک کتاب رسوم ہند بھی داخل تھی۔ اور سکول میں سبقاً پڑھائی جاتی تھی۔ میں نے بھی اس کتاب کو پڑھا جسطرح اور ہزاروں طلباء اُسے سالہا سال سے پڑھتے چلے آ رہے تھے۔ مگر

مجھ پر اُس کتاب نے ایسا مقناطیسی اثر کیا۔ کہ میری کایا پلٹ ہو گئی۔ میں ظلمات کی گھٹا سے نکل کر اُجالے میں آگیا۔ اور میرے خیالات نے ایسا پلٹا کھایا۔ کہ بُت پرستی کے موروثی جذبہ پر بت شکنی و وحدت پرستی کا فطرتی نور غالب آگیا۔ اور میں قیدِ بُت خانہ و بُتاں سے نجات پا کر خدائے واحد و یگانہ کا آزاد بندہ بننے لگ گیا۔ میرے دل کی کھیتی میں حبِ اسلام کا پہلا پاک اور مقدس تخم اُسی قیمتی کتاب کے مطالعہ سے بویا گیا جس کے مصنف نے نہ معلوم کس پاک نیت اور نیک ارادے سے اِس کتاب میں نور اور ظلمت کو ایسے رنگ میں یکجا جمع کر دیا ہے۔ کہ فطرت سلیم اس سے متأثر ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔

اور مجھے معلوم ہے۔ کہ میری طرح بہت سے تشنگانِ حق کی سیری کا فخر اس کتاب کو مجھ سے پہلے بھی حاصل ہو چکا ہے۔ اور بیسیوں گم گشتگانِ راہِ ہدائت کی راہنمائی و راہبری کا وہ موجب ہو چکی ہے۔ قابل اور نیک دِل مصنف نے بغیر کسی اشارہ اور بغیر کسی ایک بھی تبلیغی فقرہ لکھنے کے ابتدا میں ہندوؤں کے مذہبی رسوم و رواج اُن کے اکابر کے بعض حالات اور معاشرتی آئین درج کر دیئے ہیں۔ اپنی طرف سے کوئی جرح کی ہے نہ تنقید۔

دوسرے حصہ میں مسلمانوں کے عقائد، رسوم و رواج اور انبیاء کے حالات درج کر کے آخر میں صرف ایک سبق آموز افسانہ لکھ دیا ہے۔ اور بس۔

طرزِ تحریر بالکل غیر جانب دارانہ ہے۔ اور واقعات مندرجہ کی صحت و اصلیت کی تصدیق کتاب مذکور کو ٹیکسٹ بک (نصاب تعلیم مروجہ وقت) کر کے دونوں قوموں کے نمائندوں نے کر دی تھی۔ کتاب کیا تھی ایک شفاف آئینہ تھا جس میں نور اور ظلمت دونوں کا فوٹو ہوبہو (اس زمانہ کے خیالات اور تحقیق کے مطابق) یکجا جمع تھا۔ اور ہر فطرت اپنی استعداد و قابلیت اور مناسبت کے لحاظ سے اپنے ہمجنس کی طرف جھک جانے پر مجبور تھی۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے ایک زمانہ تک سینکڑوں ہی نیک فطرت انسانوں کی ہدائت و راہنمائی کی عزت اِس کتاب کو بخشی۔ مگر آخر کار متعصب اور مالدار سرکاری اداروں پر قابو یافتہ ہندوؤں کی کوشش کا شکار ہو کر نصاب تعلیم سے خارج کر دی گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

میرے خیالات کا یہ انقلاب ۱۸۸۹ء۔ ۱۸۹۰ء یا زیادہ سے زیادہ ۱۸۹۱ء سے تعلق رکھتا ہے اور اللہ تعالےٰ کی شان ہے۔ کہ اسی زمانہ میں چونیاں پر عیسائی مشنریوں نے دھاوا بول رکھا تھا۔ اور ان کے مناد اور پریچر نئے نئے رنگ میں لوگوں کا متاعِ ایمان چھین لینے اور اُن کے مذہبی عقائد پر ڈاکہ ڈالنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ کبھی تو وہ اپنے خاص انداز اور شان و شوکت کی نمائش کرتے کبھی بچوں اور نوجوانوں کے دل موہ لینے کے وسائل اختیار کرتے۔ اور کبھی کبھی نہائت ہی خوبصورت اشیاء کی تقسیم عام کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنی طرف مائل کیا کرتے اور تماشا اور تصاویر دکھا کر نوجوانوں کے دل لبھانے اور طمع دیکر پھانسنے تک سے بھی دریغ نہ کیا کرتے۔

دوسری طرف ہندو قوم چونکہ بڑی ہوشیار اور موقعہ شناس واقعہ ہوئی ہے۔ اس نے جب عیسائیوں کی سرگرمیوں کو دیکھا۔ تو اپنی نئی پود کو سنبھالنے کی کوشش و فکر میں لگ گئی۔ اور آریوں نے نت نئے جلسے جلوس اور نگر کیرتن کے رنگ جمانے شروع کر دیئے۔ ان کے بڑے بڑے اپدیشک آتے لیکچرز ہوتے۔ اور بحث مباحثے کے اکثر اکھاڑے لگے رہتے۔ اس طرح ہندوؤں نے تو اپنی عقلمندی سے اپنے نوجوانوں کا رُخ پلٹ لیا۔ اور جو رنگ عیسائی مناد اختیار کرتے ہندو بھی اُن سے پیچھے نہ رہتے۔ گانے بجانے میں تو استریوں کی شرکت کیوجہ سے آریوں کے اکھاڑے عیسائیوں سے بھی بارونق ہو جایا کرتے۔ باقی رہ گئے بیچارے مسلمان جو بے سری فوج یا بغیر دولہا کی برات تھے۔ منتشر اور بکھری ہوئی بھیڑوں کی طرح اُن کو جو چاہتا اچک لیتا تھا۔ کوئی نگران تھا۔ نہ پاسبان۔ بعض خاندانی لوگ عیسائیت کا شکار ہو گئے۔ اور بعض آرین خیالات کی وجہ سے دہریہ بن گئے۔

غرض وہ زمانہ بھی عجیب کشمکش کا زمانہ تھا۔ اور چونیاں کا شہر ریلوے سے دور ہونے کی وجہ سے عیسائیوں اور آریوں کا ایک شکار گاہ بن رہا تھا۔ اور عام حالات کے لحاظ سے کہا جا سکتا تھا۔ کہ دونوں کا حملہ اسلام کے خلاف تھا۔

میرے قلب کی بھی عجیب کیفیت تھی۔ اسلام کی محبت میرے دل میں گھر کر چکی تھی۔ اور حلاوتِ ایمانی میرے رگ و پے میں سرائت کر گئی تھی۔ مذہب اور خدا کا خیال میرے دل میں نمایاں جگہ لے چکے تھے۔ اِس لئے میں عیسائیوں کے لیکچروں میں بھی چلا جاتا۔ کیونکہ وہ بھی خداوند خدا، خداوند خدا کے نام پر پکارتے

اور بلایا کرتے تھے۔

میں آریوں کے جلسوں اور جلوسوں میں بھی شامل و شریک ہو جایا کرتا۔ کیونکہ وہ بُت پرستی کے خلاف اور توحید کی تائید میں گیت گاتے۔ اور پکار پکار کر ایشور پرماتما اور سرب شکتیمان کے نام پر بلایا کرتے تھے۔

میں خیالات کے لحاظ سے ایک طرف سے تو بالکل کٹ چکا تھا۔ اور نیا پیوند میرا ابھی بالکل تازہ تھا۔ جسے کوئی پانی دینے اور سینچنے والا نہ تھا۔ گو قلبی کیفیت کے لحاظ سے مجھے اطمینان اور تسلّی تھی۔ کہ اِسلام (جسے میں ابھی تک صرف نام کے لحاظ سے ہی جانتا تھا اس کی تفاصیل اور کیفیات سے جاہل مطلق تھا) ہی سچا مذہب ہے۔ اور یہ بات میں نہیں سمجھتا۔ کہ کیونکر میرے دل میں بیخ فولاد کی مانند گڑ گئی تھی۔ مگر تاہم میں عیسائیوں اور آریوں کی مجالس میں شریک ہوتا۔ کہ شائد وہ چیز جس کی مجھے تلاش ہے۔ انہی کے ہاں سے ملے۔

مگر میں سچ سچ کہتا ہوں۔ کہ مجھے کبھی ایک لحہ کے واسطے بھی ان دونوں خیالات کے بڑے سے بڑے لیکچراروں کے عالمانہ خطبے اور لیکچر سن کر اس چیز کی صداقت میں شک وشبہ نہ پیدا ہوُا۔ جس کو خدا نے اپنے فضل سے خود اپنے ہاتھوں میرے دل میں گاڑ دیا تھا۔ بلکہ میرا ایمان اور یقین اور بھی ترقی کرتا چلا گیا۔ اور اگرچہ اِس روحانی پودے کی آبیاری کرنیوالے کوئی بھی ظاہری سامان موجود نہ تھے۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ (کیونکہ مسلمانوں پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور وہ خواب غفلت میں تھے۔ اور کفر موجزن تھا) مگر وہ بیج خدا سے غذا پاتا اور بڑھ کر مضبوط ہی مضبوط ہوتا چلا گیا۔ الحمدللہ

اُسی زمانہ میں اللہ تعالےٰ نے اپنی باریک در باریک حکمت اور مصلحت کے ماتحت یکے بعد دیگرے دو خواب دکھا کر میرے ایمان کو تازہ اور مضبوط بنا دیا۔

پہلا رویاء جو مجھے دکھایا گیا۔ اُس میں قیامت کا نظارہ تھا۔ جو اپنی ساری تفاصیل اور کیفیات (میرے اُس وقت کے خیالات اور علم و وسعت کے مطابق) کے ساتھ مجھے ایک کمرہ کے اندر دکھایا گیا۔ جو بمشکل ۱۰×۱۰ فٹ ہوگا۔ اور وہ اس سکول کا دفتر تھا۔ جس میں مَیں تعلیم پایا کرتا تھا۔ (اُن دنوں چونیاں کا مدرسہ شہر کے جنوبی جانب واقعہ تھا۔ جو بعد میں شہر کے شمالی جانب آبکاری کی جگہ پر نیا سکول بن جانے پر نیلام ہو کر گنگ منڈی میں تبدیل ہوگیا)

یہ ایک نظارہ تھا۔ جو مجھے دکھایا گیا۔ اس میں کوئی آئندہ کی خبر تھی نہ علمی بات۔ گو یہ محض ایک نظارہ تھا۔ مگر اس سے میرے قلب کو وہ طاقت ملی اور میرے ایمان میں اتنی تازگی آئی۔ کہ آج تک بھی میں اس اثر اور لذت اور قوت وشوکت کو محسوس کیا کرتا ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ واقعی وہ ایک قیامت تھی۔ جو میرے پہلے خیالات پر آئی۔ یا عیسائیوں اور آریوں کے خیالات سُن سُن کر اگر کوئی اثر مجھ پر نہاں در نہاں ہوُا بھی تھا۔ تو اِن خیالات پر بھی وہی قیامت آگئی تھی۔ واللہ اعلم

دوسرا خواب بھی قریبًا قریبًا اسی زمانہ میں یہ دکھایا گیا کہ ایک وسیع اور شفاف قطعۂ آب ہے۔ جس میں بعض آبی جانور بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ میں اس میں تیرتا اور غسل کرتا پھرتا ہوں۔ پانی اتنا گہرا نہیں۔ کہ مجبورًا مجھے تیرنا پڑتا ہو۔ محض شوق کے طریق سے کبھی تیرتا ہوں۔ اور کبھی کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اچانک ایک مگرمچھ (گھڑیال) مجھ پر لپکا۔ اور اس نے مجھے نگلنا شروع کر دیا۔ پہلے پاؤں پکڑے اور ہوتے ہوتے کمر تک مجھے نِگل گیا جب میں نے دیکھا۔ کہ میرے جسم کا نصف حصّہ ایک خطرناک اور زبردست دشمن کے قبضہ میں ہے۔ تو معًا کسی بیرونی تحریک کے ماتحت میں نے اپنے دونو ہاتھ پھیلا دیئے اس خیال سے کہ ایسا کرنے سے وہ اَب مجھے نگل نہ سکیگا۔ کیونکہ اس کا مونہہ چھوٹا ہے۔ اور میرے ہاتھوں کا پھیلاؤ بہت وسیع ہوگیا ہے۔

اور ساتھ ہی میں نے دونوں ہاتھوں سے اس مگرمچھ کے مونہہ، سر اور آنکھوں کو نوچنا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں وہ کمر سے آگے نگل بھی نہ سکا۔ بلکہ مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اور اس طرح میں اُس کے پھندے سے صحیح سلامت بچ گیا۔ اور میرے جسم پر کوئی گزند بھی نہ پہنچا۔ الحمدللہ، الحمدللہ ثم الحمدللہ علیٰ ذالک

میرے خیالات کی تبدیلی اور قلبی انقلاب کا نتیجہ یہ ہوُا۔ کہ مجھے ہندو طلباء اور دوستوں کی بجائے مسلمان طلبا اور لڑکوں سے محبّت ہونے لگی۔ اور روحانی انقلاب کی طرح جسمانی تعلقات میں بھی ایک نمایاں تبدیلی واقعہ ہوگئی سکول میں کلاس کے اندر اور سکول سے علاوہ اٹھنا بیٹھنا کھیلنا، کودنا، ملنا جُلنا اور چلنا پھرنا غرض عام سوسائٹی کے تعلقات کا نقشہ ہی پلٹ گیا۔

ہمارے استاد ہمیں مضمون نویسی کی مشق کرایا کرتے اور بعض اوقات debate بھی کلاس میں ہوُا کرتی تھی۔ میرے مضامین میں اسلامی رنگ اور debate میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر غالب ہونے لگا۔ اور نوبت بعض اوقات یہاں تک پہنچ جایا کرتی۔ کہ بعض متعصب لڑکے بحث سے تنگ آکر کھلم کھلا مجھے مسلمان یا مسلمانوں کا طرفدار کہنے لگ جاتے۔

میرے سکول کے ہیڈ ماسٹر اس زمانہ میں ایک مسلمان مولوی فاضل و منشی فاضل مولوی جمال الدین صاحب آف کُلیانی متصل قصور تھے۔ اور اُن کے نائب ایک صاحب منشی یا مولوی عبداللہ صاحب تھے۔ جو وہ بھی غالبًا اُسی قصبہ کُلیانی ہی کے باشندے یا اُس کے آس پاس کے رہنے والے تھے۔ اور دو اُستاد ہندو اور سکھ تھے۔ مضمون نویسی کا بچپن میں مجھے زیادہ شوق تھا۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہوئی۔ کہ "رسوم ہند" کے مطالعہ کا اثر میرے دل پر نہائت گہرا اور پائیدار تھا۔ میں اُسی اثر کے ماتحت مضامین میں سادگی سے اپنی قلبی کیفیات کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ جس سے ہندو طلباء جو زیادہ متعصب اور آریہ خیالات میں پرورش پاتے تھے۔ خواہ مخواہ کھینچ تان کر مجھے اپنا مدّمقابل بنا لیتے اور اسطرح بحث شروع ہو جاتی۔ اور یہی وجہ ہوئی۔ کہ ہوتے ہوتے میرے خیالات اور بھی زیادہ وسیع اور پختہ ہوتے چلے گئے۔ اور مجھے ہندوؤں سے نفرت اور مسلمانوں سے محبّت بڑھنے لگی۔ آخر یہ ہوُا۔ کہ میری نشست و برخواست اور ربط و اختلاط مسلمانوں سے بہت بڑھ گیا۔ اور ہندوؤں سے قریبًا قریبًا میں کٹکر الگ ہی ہوگیا۔ اور اَب میں بجائے منادر و شوالوں اور دیوی دواروں کے مساجد کے دروازوں پر جا کھڑا ہوتا کبھی اُن کی چار دیواری پر بیٹھ کر صفیں باندھے قطار در قطار کمربستہ کھڑے مسلم نمازیوں کو خدا کی عبادت کرتے اس کے حضور گرتے اور اسی سے دعائیں کرتے دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں لطف اٹھاتا۔ اور اثرات قبول کیا کرتا۔ خصوصًا جبکہ نماز باجماعت ہو رہی ہوتی اور مسلم لوگ قطار در قطار صفوں میں کھڑے ہوتے کبھی رکوع کرتے اور کبھی سجدات میں گر جاتے۔ یہ نظارہ میرے لئے نہائت ہی دلکش، دلآویز اور رُوح پرور ہوُا کرتا تھا۔

میں عید کے روز عیدگاہ کی چار دیواری پر جا بیٹھتا اور جمعہ کو جمعہ پڑھنے والوں کے حرکات کو محبّت بھری نگاہوں سے جمعہ مسجد کے صحن یا چار دیواری سے جھانک جھانک کر اپنی روحانی ترقی کے سامان اور قلبی مسرّت حاصل کیا کرتا تھا۔ اور اُن باتوں کے لئے میرا کوئی بھی ظاہری محرک نہ تھا۔ صرف میرے دل کی خواہش اور روحانی تحریک ہی میری محرک ہوُا کرتی تھی اَب مجھے بجائے بُت گروں اور بُت پرستوں کے موحدوں۔ خدا پرستوں اور بُت شکنوں سے محبّت تھی۔ اور بجائے بت خانوں اور بُت کدوں کے مساجد اور عیدگاہیں میری روحانی دلچسپی کا موجب تھیں۔ گھنٹے اور گھڑیال جو منادر و بُت کدوں سے صبح و مسا بجتے وہ میری توجہ کو اب پھیرنے سے قاصر تھے۔ مگر میرے تیز چلتے ہوئے قدم دوڑتے ہوئے پاؤں اور بھاگتا ہوُا جسم رُکتا اور قدم لرزہ کھا جاتے۔ تو اس خدائے برتر کے نام سے شروع ہونے والی آواز پر جو کہ اللہ اکبر، اللہ اکبر سے شروع ہوُا کرتی تھی مسجد کے صحن یا مینار سے میں جہاں بھی ہوتا۔ جدھر بھی جا رہا ہوتا۔ جس حال میں بھی ہوُا کرتا۔ اذان کے پہلے لفظ پر ہی کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ اور نہ چلتا اور مونہہ پھیرتا جب تک کہ وہ مقدس آواز پوری ختم نہ ہو جاتی۔

میں اذان کے کلمات سے بھی ناآشنا تھا۔ اسکے معانی و مقاصد سے بھی ناواقف تھا۔ مگر دل میں اِس طریق پکار، طرزِ ندا اور نام خدا کی ایک ہیبت ایک

ادب اور ایک قسم کا جوش دنشہ آجایا کرتا۔ کہ بغیر کسی گذرنے والے ہندو طعنہ زن کے طعنہ کی پرواہ کے مقام ادب پر کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ اور اُس میں مجھے ایک ایسا لطف لذت اور سرور ملتا تھا۔ جس کا میں بیان بھی نہیں کر سکتا۔ گو یہ اس وقت کے مسلمانوں کی تقلید ہی تھی۔ مگر حق یہ ہے کہ مجھے اِس راہ سے بھاری برکت ملی۔

مسلمانوں کا اُس وقت یہ حال تھا۔ کہ میرے ہیڈ ماسٹر سے لیکر ہم جماعت مسلمان لڑکوں حتیٰ کہ بعض میرے خاص دوستوں تک نے بھولے سے بھی مجھے کبھی کوئی کلمۂ خیر نہ کہا۔ اور نہ ہی اس کی اُن کو توفیق رفیق ہوئی۔ میں دن اور رات اُن کے ساتھ رہتا۔ پڑھتا بھی اور کھیلتا بھی۔ مگر کبھی کسی نے بھولے سے بھی مجھے تبلیغ نہ کی۔ حتیٰ کہ بعض اوقات میں خود بازار سے نماز کی کتاب خرید کر تنہائی میں بعض دوستوں کے گھر پر پہنچا۔ اور چاہا کہ وہ مجھے نماز کا سبق پڑھائیں۔ مگر انہوں نے کبھی کوئی عذر کر کے ٹال دیا۔ اور کبھی کوئی بہانہ بنا کر معذرت پیش کر دی۔

راہ نجات، طریق النجات اور بعض اور اردو کتب و رسائل جن کا مجھے پتہ ملتا کبھی کہیں سے کبھی کہیں سے حتیٰ کہ بعض اوقات بمبئی تک سے بعض رسائل میں ٹکٹ بھیج کر منگواتا۔ پڑھتا اور لڑکوں میں تقسیم بھی کر دیا کرتا تھا۔

بعض سادات گھرانے اور قاضی فیملی شہر میں صاحب ثروت اور علم دوست بھی تھے۔ اور میرے انہی لوگوں سے تعلقات محبت بھی تھے۔ مگر اُن کی دوستی اور محبت ووفا بھی صرف دوستی تک ہی محدود تھی۔ جسمانی تعلقات سے آگے روحانی بہبودی اور بھلائی کا کبھی کسی کو خیال بھی نہ آیا۔ مگر میں اُن کی محبت اور صحبت سے فیض یاب ہوتا گیا۔ اور میری روحانی تربیت گو انہوں نے نہ کی۔ مگر ان لوگوں کے تعلقات کا اثر ضرور مجھ پر ہوتا ہی چلا گیا۔ اور وہ بیج جو اللہ پاک نے "رسوم ہند" کے ذریعہ میرے دل میں خود اپنے ہاتھ سے گاڑا تھا۔ اُگ کر پودہ بنتا گیا۔ اور وہ صرف اور صرف اللہ تعالےٰ ہی کی آبیاری سے سینچا اور بڑھتا گیا۔

مجھے خوب یاد ہے۔ کہ رات کو سوتے وقت میں اِس بات کا خاص طور سے اہتمام کیا کرتا تھا۔ کہ میری چارپائی ایسے رُخ نہ بچھے کہ پاؤں قبلہ کی طرف ہوں اور اگر کبھی والدہ محترمہ چارپائی اُسی طرح بچھا دیتیں تو میں کوشش کر کے بجائے مشرق کے مغرب کو سرہانہ بنا کر سویا کرتا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے۔ کہ بعض اوقات باوجود کوشش کے والدہ مجھے مجبور کرتیں۔ کہ اسیطرح سو جاؤں جسطرح انہوں نے چارپائی بچھائی ہوتی تو گو میں اُن کے حکم کی وجہ سے اُسی رُخ سو جاتا مگر سوتے میں اُٹھ کر غلبہ خیال کے باعث میں پاؤں بجائے قبلہ کے مشرق کو کر لیا کرتا تھا۔ اور والدہ صبح کو دیکھ کر خفا بھی ہؤا کرتیں۔ کہ یہ کیا عادت ہے کہ تم سرہانے کی بجائے پائینتی کی طرف سو جاتے ہو۔

خدا کا کرنا ایسا ہؤا۔ کہ ۱۸۹۴ء و ۱۳۱۱ھ کے ماہ رمضان المبارک میں مہدیٔ آخرالزماں کے ظہور کی مشہور علامت یعنی کسوف اور خسوف پوری ہو گئی۔ آج تک وہ نظارہ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور وہ الفاظ میرے کانوں میں گونجتے سنائی دیتے ہیں۔ جو ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب مولوی جمال الدین صاحب نے اس علامت کے پورا ہونے پر سکول کے کمرہ کے اندر ساری جماعت کے سامنے بولے تھے۔ کہ:-

"مہدیٔ آخرالزماں کی اَب تلاش کرنا چاہیئے۔
وہ ضرور کسی غار میں پیدا ہو چکے ہیں۔ کیونکہ
اُن کے ظہور کی بڑی علامت آج پوری ہو چکی"۔

میں بھی جماعت میں موجود تھا۔ وہ کمرہ وہ مقام، اور لڑکوں کا وہ حلقہ اب تک میری نظر کے سامنے ہے۔ وہ کرسی جس پر بیٹھے ہوئے مولانا نے یہ الفاظ کہے۔ وہ میز جس پر ہاتھ مار مار کر لڑکوں کو یہ خبر سنائی خدا کے حضور ضرور اس بات کی شہادت دیں گے۔ کہ مولوی صاحب موصوف پر اتمام حجت ہو چکی۔

"مہدیٔ آخرالزماں" میرے کان ابھی تک اِس نام سے ناآشنا تھے۔ اُن کا کسی "غار میں پیدا ہونا" "اُن کے ظہور کی بڑی علامت"۔ یہ الفاظ میرے واسطے اور بھی اچنبہ تھے۔ میں مڈل میں تعلیم پاتا تھا۔ طبیعت میں ٹوہ کی خواہش پیدا ہوئی۔ استاد سے بوجہ حجاب اور ادب نہ پوچھ سکا۔ آخر ہم جماعتوں سے اس معمہ کا حل چاہا۔ جنہوں نے اپنے مروجہ عقیدہ وخیال کے مطابق مجھے سارا قصہ کہ سنایا۔ عام مسلمانوں میں ظہور مہدی آخرالزماں کے متعلق جو خیالات، روایات اور قصے کہانیاں رائج تھیں۔ اور مہدیٔ آخرالزماں کے ظہور سے مسلمانوں کی جو امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ زبان زدِ خلائق ہیں۔ اُن کے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ میرے دل میں جو باتیں ان قصوں کو سُنکر پیدا ہوئیں۔ اور جنہوں نے میری روحانیت میں اور اضافہ کیا۔ وہ ذیل کی چند باتیں ہیں۔

۱- تیرہ سو سال قبل ایک واقعہ کی خبر دینا۔ جو دوست دشمن میں مشہور ہو چکی ہو۔ اور پھر اس کا عین وعدہ کے مطابق پورا ہو جانا۔

۲- وہ واقعہ انسانی کوشش کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ آسمان پر ہؤا۔ جہاں انسان کی پہنچ نہیں۔ اور نہ ہی انسان کا کسی قسم کا اُس میں دخل ہے۔

۳- مہدی آخرالزماں کی شخصیت۔ اُس کا کفر کو مٹانا۔ اسلام کو بڑھانا۔ اور اسلامی لشکر تیار کر کے کافروں کو تلوار کے گھاٹ اُتارنا۔ اور مسلمانوں کی فتوحات کے خیالات۔

۴- دعا اور اُس کی حقیقت۔ خدا کا بندوں کی دعاؤں کو سُننا اور قبول کرنا۔ کیونکہ اولیاء اُمتِ محمدیہ مہدیٔ آخرالزماں کے لئے دعائیں کرتے رہے ہیں۔ آخر وہ قبول ہوئیں۔

۵- یہ باتیں اسلام کی صداقت کی واضح اور بیّن دلیل ہیں۔ اور اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے۔ جو خدا کو پیارا اور خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

یہ پنجگانہ امور اپنی مجمل سی کیفیت کے ساتھ میرے دل پر اثر انداز ہوئے۔ اور اس واقعہ نے میرے ایمان میں ترقی وتازگی اور روحانیت میں اضافہ کر دیا۔ اور میں بھی مہدیٔ آخرالزمان کو پانے کے لئے بیتاب ہونے لگا۔ جس کے حصول کے لئے مجھے دعاؤں کی عادت ہو گئی۔

میں راتوں کو بھی جاگتا۔ اور دن میں بھی بے قرار رہتا۔ اور مہدی آخرالزمان کی تلاش کا خیال بعض اوقات ایسا غلبہ پاتا۔ کہ میں دیوانہ وار جنگل میں نکل جایا کرتا۔ اور پکار پکار کر اور بعض اوقات رو رو کر بھی اللہ تعالےٰ کے حضور اس مقدس وجود کے پانے کے لئے التجائیں کیا کرتا تھا۔

چونیاں شہر اور اس کے نواحی کھنڈرات جن لوگوں نے دیکھے ہیں۔ وہ اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ وہ کھنڈرات کتنے پیچیدہ۔ بھیانک اور ڈراؤنے واقعہ ہوئے ہیں۔ اور اُن کا سلسلہ کتنا لمبا اور خطرناک چلا گیا ہے۔ خصوصاً مٹھو شاہ مقبرہ کے گرداگرد اور اس سے بھی آگے ہندو مندر کے آس پاس۔ مگر میں باوجود اپنی اس کم سنی کے تنہائی کی تلاش میں اور اس خیال سے کہ کوئی متنفس میری آہ وبکا اور دعا و پکار کو سُن نہ پائے بے دھڑک شوق سے ان کے پیچ در پیچ غاروں کے اندر چلا جاتا اور دل کھول کر دعائیں کیا کرتا تھا۔

ان واقعات کو سننے یا پڑھنے والے تو تعجب کرینگے ہی مگر میں خود بھی اپنے اُن حالات کو سامنے رکھ کر بیحد متعجب ہؤا کرتا ہوں۔ اور حقیقت یہی ہے۔ کہ وہ حالات تھے بھی حیرت ناک اور تعجب انگیز۔ اور اُن میں دیوانگی اور جنون کا رنگ پایا جاتا تھا۔ میں مجلسی زندگی سے متنفر اور تنہائی پسند ہو گیا۔ اور آبادی کی نسبت جنگل اور ویرانے مجھے بھانے لگے۔ اور اسی میں میری راحت خوشی اور سارا سرور ہؤا کرتا تھا۔

میں کھیل کود کا مشتاق تھا۔ میرا بدن چھریرا مگر مضبوط تھا۔ سکول کے جمناسٹک ماسٹر جسمانی ورزش کے کرتبوں۔ دوڑ۔ پھاند اور کرکٹ کی وجہ سے خوش تھے۔ مگر یہ ساری باتیں ایک عرصہ کے لئے مجھ سے جُدا ہو گئیں۔ اور مجھے کسی چیز سے سوائے تنہائی میں دعا کے دلچسپی باقی ہی نہ رہ گئی۔

اور یہ سب کچھ محض اللہ تعالےٰ کے فضل سے تھا، میری عقل، تدبیر یا کوشش کو قطعاً اس میں کسی قسم کا دخل نہ تھا۔ جس طرح اللہ تعالےٰ نے خود میری خواہش بلکہ علم کے بھی بغیر میرے سینہ و دل میں ایمان

کا بیج بویا۔ شگوفہ نکالا، اور اس کی آبیاری فرما کر پودا بنا دیا اسی طرح غیب ہی سے اُس نے خود سارے سامان اس کی حفاظت اور ترقی کے بھی جمع فرما دیئے۔ مجھ سے اگر کوئی دلیل کا طالب ہوتا۔ تو مَیں نفی میں جواب دیتا۔ اور صرف یہ بتا سکتا۔ کہ میرے دل میں اُن صداقتوں کا آفتاب اور مہتاب کے وجود کی طرح یقین ہے۔ اس کے سوا کوئی دلیل نہ تھی۔ کیونکہ میں نے اس نور کو کسی دلیل سے حاصل نہ کیا تھا۔ بلکہ خود خدا نے مجھے وہ نور دیا تھا۔

یہ سلسلہ کم وبیش جاری ہی تھا۔ کہ اللہ تعالےٰ نے ڈاکٹر سید میر حیدر صاحب کو چونیاں میں پہنچا دیا۔ (ڈاکٹر صاحب موصوف حضرت میر حامد شاہ صاحب سیالکوٹی رضؓ کے رشتہ دار تھے) ڈاکٹر صاحب کے ایک صاحبزادے سید بشیر حیدر صاحب میرے کلاس فیلو بنے۔ جن سے مجھے خاص طور سے محبت تھی۔ اور وہ بھی مجھ سے بہت مہربانی ومحبت سے پیش آیا کرتے تھے۔ سید بشیر حیدر صاحب کا چونیاں آنا۔ میرا کلاس فیلو بننا اور مجھ سے تعلق محبت پیدا کر لینا میرے لئے اَور بھی رحمت وبرکت کا موجب ہوگیا۔ اور اُن کے آنے سے میری زندگی کا ایک بالکل نیا دور شروع ہوگیا۔

سید بشیر حیدر صاحب کے بڑے بھائی مکرم سید نذیر حیدر صاحب بھی ڈاکٹر صاحب موصوف کے ہمراہ ہی چونیاں میں تھے۔ اور وہ بھی مجھ سے بحسن سلوک پیش آتے اور محبت ومروّت کا معاملہ فرماتے۔ مگر وہ چونکہ مجھ سے عمر میں بڑے تھے۔ میں بوجہ ادب اُن کے سامنے کم آتا تھا۔ تاہم وہ بھی ہر لحاظ سے ہماری تربیت کا خیال رکھا کرتے اور موقعہ ومحل پر نصیحت وخیر اندیشی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔

عجیب اتفاق کی بات ہے۔ کہ اُس زمانہ میں بھی میرے دوست مجھے "بھائی جی" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اور مجھے عزت ومحبت کی نظر سے دیکھا کرتے اور مجھے بھی یاد ہے۔ کہ میں عموماً اپنے دوستوں کو نیکی کی ترغیب دلاتا رہتا تھا۔ حتّٰی کہ بعض اوقات اُن کو تحریص دلانے کی خاطر میں خود روزے بھی رکھا کرتا تھا۔ جس سے میرے دوست متاثر ہوتے اور روزے رکھنے لگ جایا کرتے۔ غرض وہ لوگ میرے اور میں اُن کا خیر خواہ تھا۔ اور ہم لوگ ایک دوسرے کو نیکی کی ترغیب دلاتے اور بُرائی اور بدیوں سے روکا کرتے تھے۔ ہم لوگ ہم عمر تھے۔ نوجوان تھے اور ہماری ایک پارٹی تھی زبردست ہم لڑتے بھی تھے مگر اشرار سے۔ ظالم اور بدمعاشوں سے بدی اور ظلم کو مٹانے کی خاطر نہ کہ نیکی سے روکنے کی غرض سے۔

الغرض ایک عجیب زمانہ تھا۔ اور جب اس کی یاد آتی ہے دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔ اور وہ سب دوست نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ جو آج بالکل جدا جدا ہیں۔ غالباً سنہ ۱۸۹۴ء کا آخر تھا۔ کہ میرے چھوٹے بھائی (بہاری لال مہتہ جو فوت ہو چکے ہیں۔ اور چند بچے اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں) کی کسی مسلمان لڑکے سے لڑائی ہوگئی۔ لڑائی میں مسلمان لڑکا مغلوب ہوگیا۔ اور اس نے اپنے بچاؤ کے لئے اُس راز کو بھی قربان کر دیا۔ جو میرے خیالات کے متعلق مسلمان لڑکوں کے خاص حلقہ میں مدت سے بطور امانت چلا آرہا تھا۔ اور میرے بھائی سے یوں مخاطب ہؤا۔ کہ

"آپ کے بڑے بھائی تو مسلمان ہیں مسلمانوں سے محبت وہمدردی رکھتے ہیں۔ مگر آپ مسلمانوں سے لڑائی کرتے ہیں۔"

اِن الفاظ نے میرے عزیز پر بجلی کا اثر کیا۔ اُن کے جسم پر ایک لرزہ آگیا۔ اور ان کی گرفت ڈھیلی پڑگئی اِس طرح وہ مسلمان لڑکا تو بچکر بھاگ گیا۔ مگر میرا چھوٹا بھائی چند لمحہ حیران وششدر رہ کر آخر جوش غیض میں رونے لگا۔ اور روتے ہی روتے گھر پہنچا۔ والدہ نے ماجرا پوچھا۔ تو دیر کے بعد روتے روتے وہی قصہ کہ سنایا۔ کہ مجھے آج فلاں لڑکے نے کہا ہے۔ کہ "تمہارا بڑا بھائی مسلمان ہوگیا ہے۔"

والدہ محترمہ سنجیدہ اور عقلمند خاتون تھیں۔ انہوں نے بات کو ٹال دیا۔ اور میرے عزیز کے خیال کو کسی دوسری طرف لگا کر وقت گزار دیا۔ بچّوں کی ناراضگی اور جوش وقتی ہوتا ہے۔ آخر وہ بات اُن کے دل سے تو نکل گئی مگر والدہ محترمہ نے بغیر اس کے کہ مجھے اسبارہ میں ایک لفظ بھی کہا ہو نہائت احتیاط سے اور محتاط لب ولہجہ سے میرے والد صاحب کو اطلاع کر دی۔ جو اندنوں نکّے ماڑی کے نہری بنگلہ پر پٹواری تھے۔ لائل پور بڑی نہر سے جانب غرب واقعہ ہے۔ یہ بنگلہ نہر کے کنارے جانب شرق واقعہ تھا۔ اور لائل پور کا شہر اس زمانہ میں ابھی آباد نہ تھا۔ بلکہ جہاں اب شہر ہے۔ بالکل جنگل اوؔ بیابان تھا۔

میرا چونکہ امتحان ٹدل قریب تھا۔ جو کہ اس زمانہ میں لاہور جا کر دینا پڑتا تھا۔ اس وجہ سے والد صاحب نے بھی ضبط کیا۔ اور وہ دن خاموشی سے گزار دیئے۔ مگر میرے امتحان مڈل اور اس کے نتیجہ نکلنے کے مَابعد غالباً فروری یا مارچ سنہ ۱۸۹۵ء میں (ان دنوں میں ماہ رمضان کا مبارک مہینہ تھا۔) اچانک دو تین گھوڑیاں اور ایک اونٹ لے کر سارے کنبہ کو چونیاں سے لیجانے کی غرض سے تشریف لے آئے۔ اور اَب بھی والد صاحب نے مجھے اُس اَمرِ معلوم کے متعلق کچھ نہ کہا سُنا بلکہ اپنی تنہائی اور تکلیف کی وجہ بتا کر ہم سبکو تیاری کا حکم دیا۔ مکرمہ والدہ صاحبہ کو چونکہ یقین تھا۔ کہ ہم لوگ اب چونیاں میں نہ رہ سکیں گے۔ لہذا انہوں نے اندر ہی اندر رخت سفر سمیٹ سنبھال کر نیم سی تیاری کر رکھی تھی۔ اس وجہ سے بالکل ہی اچانک اور غیر معمولی جلدی میں ہماری چونیاں سے روانگی ہوگئی۔

میرے والد صاحب کے تشریف لاتے ہی مجھے اور میرے تمام دوستوں کو آنے والی جدائی کا احساس پیدا ہوگیا۔ جس کے بعد بمشکل ایک دن اور ایک رات ہمیں مل بیٹھنے کو نصیب ہوئی۔ میرے دوست میری جدائی کی وجہ سے اور میں اُن کی جدائی کے خیال سے بیتاب وبے قرار تھے۔ مگر کچھ پیش نہ جاتی تھی۔ نہ کوئی حیلہ نظر آتا تھا۔ امتحان مڈل میں فیل تھا۔ میں نے کوشش کی۔ کہ نئے سال کی جماعت بندی کی تعلیم کے حرج کے خیال کی مدد لوں۔ مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ اور والد صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ کہ لاہور کے ڈی اے وی سکول میں بھیجینگے۔ والد صاحب کے اُن الفاظ نے میرے پر اور بھی رنج والم اور یاس وقلق کا پہاڑ گرا دیا۔ جس سے درد کی کوئی انتہا ہی نہ رہی۔

دوستوں سے مشورے کئے۔ حقیقت سنائی۔ مگر کچھ نہ بنا۔ آخر اس سمجھوتے پر کہ وہ لوگ میرے لئے رمضان میں دعائیں کریں گے۔ اور خط وکتابت بحروف انگریزی (کیونکہ والد صاحب انگریزی نہ جانتے تھے) جاری رکھ کر تعلق قائم رکھیں گے۔ اُسی رمضان المبارک میں سحری کے وقت جبکہ بندگانِ خدا اپنے خالق ومالک کے حکم کی تعمیل میں سحری پکانے کھانے میں مصروف تھے۔ یا بعض صالح اور نیک دل پاک نفس لوگ یادِ خدا میں مصروف تھے۔ میں بادلِ ناخواستہ بصد حسرت وہاں سے جدا ہؤا۔ میرے قریباً سارے ہی دوست جو شہر کے مختلف حصّوں میں رہتے تھے۔ مجھے الوداع کہنے کو پہنچے اور رات کے اندھیرے میں قریباً ایک میل دور تک میرے ساتھ آخری باتیں کرتے چلے گئے۔

میرا دل آج بھی جبکہ میں اُس گھڑی کی یاد میں ہوں رنج ودرد سے بھرا ہؤا ہے۔ اس واقعہ کو پورے چالیس برس (شمسی حساب سے) گزر چکے ہیں۔ مگر آج میں یوں محسوس کرتا ہوں۔ کہ وہ دن آج پھر لوٹ آیا ہے۔ اُس درد کی کہانی اور مفارقت کا قصّہ بیان کرنے کی مجھ میں تاب نہیں۔ اُسے چھوڑتا ہوں۔

چونیاں کی تعلیم کے زمانہ میں چند ماہ کا وقفہ بھی ہوگیا تھا۔ جس کی تاریخ اور سنہ کا مجھے صحیح طور سے علم نہیں۔ یوں ہؤا۔ کہ میرے والد صاحب کی تبدیلی تحصیل قصور کے بعض دیہات میں ہوگئی۔ ان میں سے ایک کا نام غالباً دوبُرجی تھا۔ وہاں اکثر ڈوگر لوگ رہتے تھے۔ اس زمانہ میں چند ماہ کے لئے چونیاں سے مجھے قصور کے سکول میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ مگر یہ صرف چند ماہ کا زمانہ تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے کوئی خاص بات یاد نہیں۔

سکول کی طرف سے مجھے لوکل وڈسٹرکٹ ٹورنامنٹ میں بھی حصّہ لینے کے مواقع آئے جن میں سے بعض میں نمایاں طور سے مجھے کامیابی ہؤا کی۔ اور عموماً سب سے زیادہ انعامات پانے کا موقع ملا۔ جس کی وجہ سے میرا نام

سکول کی ہر نسٹ ٹیم میں ہوتا تھا۔

ان حالات کے تحریر کرنے میں بعض ضمنی اور چھوٹے چھوٹے واقعات میں نے نظر انداز بھی کر دیئے ہیں۔ اور رؤیا اور خواب کا معاملہ صرف میری ذات سے تعلق رکھتا ہے لہذا اِس حصّہ کو بھی میں نے حذف ہی کیئے رکھنے کا خیال رکھا ہے۔ ورنہ بعض خوابیں مجھے بچپن ہی سے جبکہ میرا سینہ نورِ اسلام سے منور ہو چکا تھا۔ ایسی صاف اور واضح آیا کرتی تھیں۔ کہ اُن میں سے بعض بہت جلد اور بعض کچھ دن بعد ہو بہو پوری ہو کر میری ترقیٔ ایمان و ایقان کا باعث ہؤا کرتی تھیں۔ مگر مجھے ان پر کبھی بھی فخر نہیں ہؤا۔ بلکہ ہر ایسی حالت کو میں نے چھپانے کی کوشش کی۔ اور خدا کا محض فضل یقین کرتے ہوئے شکر گذاری میں بڑھتا گیا۔

میرے والد صاحب پُرانے زمانہ کی تعلیم کے زیور سے مزیّن تھے۔ اور لائق فارسی دان قابل منشی اور خوشخط وخوشنویس تھے۔ ان کی تعلیم فارسی بھی چونکہ مسلمان اساتذہ ہی کے ذریعہ ہوئی تھی۔ لہذا ان کے خیالات میں بھی کبھی کبھی اِسلامی جھلک نظر آجایا کرتی۔ اور ایک حد تک والد صاحب کے خیالات بھی اس راہ میں میرے خضر راہ ہوئے۔

یہ لکھنا مجھ سے رہ گیا ہے۔ کہ میری شادی بچپن ہی میں والدین نے کر دی تھی۔ جبکہ ہم لوگ دیر سنگھ والا میں رہتے تھے۔ اور میں دوسری یا تیسری جماعت میں چونیاں تعلیم پاتا تھا۔ شادی قومی رسوم ورواج کے مطابق دیرم دِتّاں تحصیل شکر گڑھ ضلع گورداسپور کے ایک دتّ گھرانہ میں ہوئی۔ میرے خسر صاحب کا نام چوہدری دلویدتہ ل جو اچھے زمیندار اور آسودہ حال آدمی تھے۔

یہ امر بھی مجھ سے لکھنا رہ گیا ہے۔ کہ باوجودیکہ اس زمانہ میں (۱۸۹۳ء و ۱۸۹۴ء) سیّدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جا بجا چرچہ تھا۔ مگر چونیاں کے مسلمان کچھ ایسی حالت جمود وسکوت میں تھے۔ کہ کم از کم میرے کان میں اُس زمانہ میں حضور پُر نور کا ذکر نہ پہنچا۔ البتہ ایک بات مجھے یاد ہے۔ کہ میرے کان میں پڑی تھی۔ جسے مَیں بعد میں قادیان پہنچ کر بلکہ اُس سے پہلے سیالکوٹ میں سمجھا۔ وہ یہ تھی کہ ایک لڑکے نے جو کسی تقریب پر لاہور وغیرہ گیا تھا۔ واپسی پر مجھ سے ذکر کیا۔ کہ اس سفر میں ایک عجیب بات سننے میں آئی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ

"ایک مسلمان مولوی نے جو بڑا عالم ہے۔ ایک انگریز کی موت کی پیشگوئی کی۔ اور وہ پوری ہو گئی۔"

اور میرے سوال پر بتایا۔ کہ

"وہ شخص دور کہیں روس کی سرحد پر رہتا ہے۔ گاؤں کا نام سنا تو تھا۔ مگر یاد نہیں رہا۔"

قریبًا دو دن رات کے سفر کے بعد ہم لوگ نہر کے اُس بنگلہ پر پہنچے جس کو اُس زمانہ میں پکّے ماڑی یا پکّی ماڑی کا بنگلہ کہتے تھے۔ اور وہاں سوائے چند کوٹھیوں اور بنگلوں کے کوئی آبادی نہ تھی۔ البتہ زمیندار لوگ بعض بعض جگہ جھونپڑیاں ڈالے پڑے تھے۔ جن میں سکھ بھی تھے اور مسلمان بھی۔

اوّل اوّل تو میں گھر کی چار دیواری کے اندر ہی رہتا اور کسی سے بات تک کرنے کا روادار نہ تھا۔ البتہ ایک خوبصورت جلد اور موزوں تقطیع کی نہائت ہی خوشخط لکھائی اور عمدہ چھپائی کی کتاب مجھے دفتر کے کمرہ سے مل گئی۔ اِن اُداسی کی گھڑیوں میں وہ میری دلبستگی اور تنہائی میں میری رفاقت کا حق ادا کرتی رہی۔ اور میں نے اس کو ایک مرتبہ نہیں دو تین مرتبہ ختم کیا۔ اس کتاب کا نام تھا "انجیل مقدس" اِس کے مطالعہ سے مجھ پر کیا اثر ہؤا؟ میں آج تک بھی حیران ہوں۔ کہ ایسی اُداسی تنہائی اور انہماک کے باوجود اِس کتاب کے بار بار مطالعہ کا میرے خیالات پر کچھ بھی اثر نہ پڑا۔ اور جو رنگ میری طبیعت پر اللہ تعالےٰ نے چڑھا رکھا تھا۔ وہ پھیکا پڑا نہ کمزور ہؤا۔

آخر ایک روز میرے والد صاحب نے مجھے ایک خط لاکر دیا۔ جو کھلا تھا۔ مگر چونکہ انگریزی الفاظ میں تھا۔ والد صاحب اُس کو پڑھ سکے نہ مطلب سمجھ سکے۔ میں وہ خط لیکر بہت خوش ہؤا۔ اور نہر کے اُس پار جنگل میں چلا گیا۔ جہاں اسکو بار بار پڑھا۔ اور پھر اس کا وہیں بیٹھ کر جواب لکھ کر ڈاک میں ڈال دیا۔ وہ میرے ایک رفیق کا خط تھا۔ جس نے چونیاں سے حسب وعدہ اپنے اور دوسرے دوستوں کے حالات لکھ کر بھیجے تھے۔ اور مجھے میرے خیالات پر پختہ رہنے کی تلقین تھی۔ اُن کا نام نامی اور اسم گرامی تھا سیّد بشیر حیدر۔

عجیب بات ہے۔ جب تک میں ان دوستوں کے درمیان تھا۔ ہر وقت اُن کے ساتھ ملکر رہتا تھا۔ اُس زمانے میں تو شاذ ہی کسی نے کبھی مجھے کوئی بھلی بات کہی ہوگی۔ جو اپنے اندر تبلیغی رنگ رکھتی ہو۔ مگر میرا اُن سے جُدا ہونا تھا۔ کہ دوستوں کے دلوں میں ایک جوش تبلیغ پیدا ہو گیا۔ اور عمومًا ہر خط میں جو مجھے ملتا تھا۔ کسی نہ کسی رنگ میں علی قدر مراتب مجھے اسلامی خیالات کی تلقین ہؤا کرتی تھی۔ قاضی فضل الحق صاحب، سیّد امداد علی شاہ صاحب و سید جعفر علی شاہ صاحبان پیر جہانیاں والے سید زین العابدین شاہ صاحب اور ان سب میں سے پیش پیش رہنے والے میرے بہت ہی پیارے اور محسن دوست سید بشیر حیدر صاحب تھے۔

میں بھی اُن خطوط کا مناسب جواب دیتا رہتا۔ اور اس طرح یہ سلسلہ خط وکتابت اتنا بڑھا۔ کہ میرے والد صاحب کو ناگوار معلوم ہونے لگا۔ اور آخر انہوں نے مجھے اس سے روک دیا۔ اور بعض کو میرے ذریعہ اور بعض کو خود لکھ کر منع کر دیا۔ کہ وہ خطوط نہ لکھیں۔ میری بیتابیٔ دل اور بیقراری کا زمانہ پھر شروع ہو گیا۔ اور خط وکتابت بند ہوتے ہی میری طبیعت پھر جنگلوں اور بیابانوں کی طرف دوڑنے لگی۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ میں اکثر دن بھر جنگل اور بنوں میں دیوانہ وار پکارا کرتا پھرتا۔ اور صرف رات گذارنے یا والدین کو حاضری دینے کی خاطر رات کو گھر آجاتا۔

لائل پور آجکل جہاں آباد ہے۔ اس جگہ اور اس سے جانب جنوب بالکل جنگل ہی جنگل تھا۔ اور اتنے بڑے بڑے پیلو (وَن) کے درخت تھے۔ کہ بعض کے نیچے پورا قافلہ ٹھہر سکتا یا سو پچاس بھینس بیٹھ سکتی۔ اُن درختوں کے گھن دار سایہ تلے بیٹھا دعائیں کیا کرتا یا بعض اشعار پڑھتا رہتا ؎

دِلا غافل نہ ہو یکدم یہ دنیا چھوڑ جانا ہے

یہ پوری نظم مجھے یاد تھی۔ یا بعض اشعار اس زمانہ کے کورس کے یاد تھے۔ جن میں درد سوز اور گداز ہوتا اکثر پڑھتا رہتا۔

اس حالت میں قریبًا مہینہ ڈیڑھ گذرا ہوگا۔ کہ والد صاحب کو کسی نے میرے حال کی اطلاع دیدی۔ جس کے نتیجہ میں والد صاحب نے اس خیال سے کہ بیکاری اور تنہائی کی وجہ سے یہ باتیں پیدا ہوئی ہونگی۔ مجھے میرے چچا چوہدری جیون مل صاحب (رشتہ میں تھے۔ حقیقی چچا کوئی نہ تھے۔ بلکہ وہ حقیقی چچا آبا یعنی میرے والد صاحب کے بڑے بھائی تھے جسے پنجابی میں تایا کرکے پکارتے ہیں) اور سیر کے پاس بھیج دیا۔ کہ میں وہاں جاکر نقشہ نویسی یا لیول وغیرہ کا کام سیکھوں۔ میرے چچا چوہدری جیون مل صاحب ایسے علاقہ کی پیمائش کر رہے تھے۔ جہاں ابھی آبادی کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ کوئی بنگلہ تھا نہ کوٹھی بلکہ سراسر سنسان جنگل اور بے پایاں ویرانہ چلا جاتا تھا۔ آبادی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ چنانچہ یہ علاقہ میری طبیعت کے لحاظ سے نہائت ہی موزوں اور مناسب ثابت ہؤا۔ اور میں پہلے سے زیادہ اور بالکل آزادانہ طور پر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

شروع شروع میں مہمانی کے خیال سے مجھے میری مرضی پر چھوڑے رکھا گیا۔ اور میں جدھر چاہتا نکل جاتا جب چاہتا واپس آجاتا۔ کوئی دیکھتا نہ پوچھتا۔ کہ میں کس حال میں رہتا ہوں۔ اور اس طرح اللہ تعالےٰ نے اس تنہائی، فرصت اور ویرانے کو میرے دل کی آبادی اور مضبوطی کا ذریعہ بنا دیا۔ میں اگر سارا سارا دن بھی اللہ کے حضور رونے اور گڑگڑانے میں گزار دیتا۔ تو کوئی دیکھنے سننے والا تھا نہ روکنے والا۔ مگر یہ فرصت زیادہ لمبی نہ ہوئی۔ اور یہ نعمت یوں مجھ سے واپس لے لی گئی کہ میرے اِدھر بھیجنے کے جلد ہی بعد میرے والد صاحب کی تبدیلی ہو گئی۔ اور وہ بجائے پکّے ماڑی کے اب ٹچکوٹ سے تین میل کے فاصلہ پر غالبًا چک نمبر ۶۲ کے حلقہ میں آگئے۔ اور یہ غالبًا ماہ مئی ۱۸۹۶ء کا زمانہ تھا۔

کام جس کے سیکھنے کے خیال سے مجھے بھیجا گیا تھا ابھی تک میں نے اچھی طرح شروع بھی نہ کیا تھا۔ کہ

نئے حلقہ میں تبدیل ہو کر آنے پر والد صاحب نے مجھے ملنے کی غرض سے بلوا بھیجا۔

مجھے جب سے والد صاحب نے دوستوں سے سلسلۂ خط و کتابت بند کر دینے کا حکم دیا بہت صدمہ تھا۔ اور میں اکثر سوچتا رہتا تھا۔ کہ کس راہ سے ان پابندیوں کو توڑوں۔ کبھی سکول میں تعلیم کی غرض سے داخل کرا دینے کے لئے عرض کرتا۔ اور جب اس کا نفی میں جواب ملتا۔ تو میں یہی عرض کر دیتا۔ کہ مجھے ملازمت ہی کہیں دلا دیں۔ تاکہ میں بیکار نہ رہوں۔ مگر یہ کہکر انکار کر دیا جاتا۔ کہ ہمیں نوکریوں کی ضرورت نہیں۔ ہم اوروں کو نوکر رکھ سکتے ہیں تو دوسروں کی نوکری کیوں کریں۔

اس زمانہ میں نہر کی پٹواری تھی تخت شاہی تھا۔ لائلپور کی بار۔ نئی زمین۔ بڑے بڑے زمیندار، پیداوار اور آمد کی کوئی انتہا تھی نہ حساب۔ ادھر نہر کے پٹواری گویا نہر کے مالک ہوتے تھے۔ جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ نئے کام کی وجہ سے انتظام مکمل تھے نہ ہو گئے قائم۔ غرض اس طرح پٹواریوں کے جہاں اختیارات بہت وسیع تھے۔ وہاں انکی آمدنی کی بھی کوئی حدبست نہ تھی۔ اور انہی خیالات کے تحت مجھے یہ جواب دیا جایا کرتا تھا۔ کہ ہمیں نوکریوں کی ضرورت نہیں۔ ہم خود نوکر رکھ سکتے ہیں۔ وغیرہ

سکول لائف میں مَیں اچھا کھلاڑی تھا۔ اور میرے کھیل کا عام چرچہ بھی تھا۔ ٹورنامنٹوں میں بھاری انعامات بھی میں حاصل کیا کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے میرے والدین کو بھی یہ علم تھا۔ کہ میں اس فن میں ماہر ہوں۔ لہذا میں اکثر والدہ سے ایسے طریق سے بات کیا کرتا کہ مجھے جمناسٹک ماسٹری پر ملازم کرا دیں۔ جس کے لئے اُن کو کوشش کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ میں خود ہی اس کے حصول کا انتظام کروں گا۔ مگر ہمیشہ مجھے جواب نفی ہی میں ملا کرتا۔

آخر میں والد صاحب کی تبدیلی کے بعد والدین اور بھائی بہنوں کی ملاقات کو چک نمبر ۶۲ پہنچا۔ اور چونکہ تین چار ہفتہ کی غیبوبت کے بعد گھر گیا تھا۔ ذکر اذکار میں اس مرتبہ بھی میں نے وہی عرض کیا۔ کہ مجھے جمناسٹک ماسٹری کی جگہ ملتی ہے۔ اور کہ مجھے فلاں جگہ سے خط بھی آیا تھا۔ آپ اجازت دیں تو چلا جاؤں۔ مگر جواب اب بھی وہی تھا۔ جو ہمیشہ پہلے ملا کرتا تھا۔

خدا کی شان مجھے وہاں آئے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے۔ کہ میرے مخلص اور للہی دوست مکرم سید بشیر حیدر صاحب کی طرف سے پھر ایک ملفوف مجھے ملا جو مصلحت الٰہی سے میرے والد صاحب کے علم میں نہ آیا۔ وہ یوں ہؤا۔ کہ ایڈریس تو وہی پہلی جگہ کا تھا۔ مگر وہاں سے ری ایڈریس ہو کر نئی جگہ آگیا۔ اور پوسٹ مَین جو ہفتہ وار دورہ پر آیا ساتھ لیتا آیا۔ اس وقت مکرم والد صاحب گھر پر نہ تھے۔ اور اس طرح وہ لفافہ براہ راست مجھی کو ملا۔

اس لفافہ میں کیا لکھا تھا۔ مجھ پر اس کا کیا اثر ہؤا۔

یہ ایک نہائت ہی دردناک قصہ اور داستانِ غم ہے جس سے میری زندگی کا بالکل ہی نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اور وہ اتنا طویل ہے۔ کہ آج اس کے لکھنے کا وقت نہیں۔ انشاء اللہ تعالٰے بشرط توفیق پھر سہی۔

سید بشیر حیدر صاحب ایک ایسے انسان تھے۔ کہ اُن کی خوبیوں کا گننا بھی میرے لئے مشکل ہے۔ اُن کو میرے ساتھ گویا فطری لگاؤ تھا۔ اور ایسی پاک محبت تھی جس کی اس عمر کے نوجوانوں میں بہت کم نظیر ملتی ہے وہ سادات خاندان کے ایک شریف ڈاکٹر کی اولاد اور معزز گھرانے کے ممبر ہونے کے لحاظ سے چونیاں کی ممتاز ہستیوں میں شمار ہوتے تھے۔ مگر باوجود اس کے اُن کو مجھ سے ایسی محبت اور اتنا گہرا تعلق تھا۔ کہ سکول میں ہمیشہ میرے پہلو بہ پہلو بیٹھتے یا کم از کم یہ کوشش ضرور کرتے۔ کہ میرے بنچ پر بیٹھیں۔

وہ تعلیم میں ہوشیار اور لائق تھے۔ اور میں بعض مضامین میں کمزور تھا۔ میری خاطر مجھے سکول کے مضامین کی تیاری کرانے کی غرض سے میرے گھر یا میری بیٹھک پر تشریف لاتے۔ اور اپنا قیمتی وقت میرے لئے قربان کیا کرتے تھے۔

باوجود ان باتوں کے وہ ہمیشہ میرا ادب اور احترام بھی کرتے۔ اور مجھ سے بہت حیا کرتے تھے۔ گو اکٹھے رہنے کے زمانہ میں انہوں نے مجھے کبھی تبلیغ نہ کی۔ بلکہ الٹا میں ہی اُن کے لئے روزے وغیرہ رکھ کر اُن کو تبلیغ کیا کرتا تھا۔ مگر جدائی کے بعد انہوں نے روحانی رنگ میں میری بہت مدد کی اور میں کہ سکتا ہوں۔ کہ میرے اظہار اسلام میں اُن کا بہت بڑا حصہ دخل تھا۔ جزاہم اللہ احسن الجزاء

مئی ۱۸۹۵ء کی تیئس تاریخ تھی۔ جب وہ ملفوف مجھے ملا۔ گو لفافہ کے ایڈریس ہی سے مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ کہ وہ سید بشیر حیدر صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہے۔ مگر مزید اطمینان کے لئے میں نے لفافہ جلدی سے کھولا اور پھر بغیر پڑھے اور مضمون سے واقف ہوئے فوراً ہی بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔ اس خیال سے کہ مبادا والد صاحب تشریف لے آئیں۔ ان کو علم ہو جائے۔ تو پھر وہ خفا ہونگے۔ کیونکہ ان کے کھانے کا وقت قریب تھا۔ اور وہ گرداوری سے واپس آنے ہی والے تھے۔

میں قلم دوات اور کاغذ لیکر گھر سے باہر ایک کھال کے کنارے گھنے سایہ دار درختوں تلے چلا گیا۔ جہاں مجھے خیال تھا۔ کہ اس وقت کوئی نہ آئیگا۔ مدت کے بعد خط آنے کی وجہ سے یا خط کے مضمون اور اس کے اثرات کے باعث میرے دل پر غیر معمولی دھڑکن اور سارے جسم پر لرزہ تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں مگر شوق بھرے دل سے میں نے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا جس کا ایک ایک فقرہ بلکہ ایک ایک لفظ میرے دل میں بیٹھتا گیا۔ اور میرا دل بے قابو ہوتا چلا گیا۔

ابتداء میں چند جملے خط و کتابت کی روک کے متعلق بطور شکوہ و شکایت رواجی خیر و عافیت اور پرسش احوال پر مشتمل تھے۔ اور اس کے بعد چند اشعار تھے جن میں انوار و برکاتِ اسلام کے ذکر کے ساتھ ہی تبلیغ اسلام تھی۔ پوری نظم تو مجھے یاد نہ رہی۔ البتہ ایک مصرعہ اس نظم کا کچھ ایسا دل میں سمایا۔ کہ آج تک یاد سے اترتا ہی نہیں۔ جو یہ تھا ؎

. . . . لے پکڑ دامن رسول کا

میں نہیں کہ سکتا۔ کہ اس نظم کہنے والے کے دل کا درد سوز یا گداز تھا جس نے مجھے ایسا دردمند کیا۔ اور مجھ میں ایسا سوز پیدا کر دیا۔ جس سے میں اتنا رویا، اتنا رویا۔ کہ اس کا بیان بھی ناممکن ہے۔ یا وہ نظم لکھ کر بھیجنے والے کے اپنے دل کی کیفیت تھی جس نے مجھے اتنا رُلایا کہ اتنا رونا اُس کے بعد مجھے صرف دو ہی یا تین مرتبہ یاد ہے۔

میں پھوٹ پھوٹ کر رو لیتا۔ اور پھر خط کو اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتا تھا جس کے بعد پھر وہی رقت قلب پر طاری ہو جاتی۔ اور میں دل کھول کر جی کی بھڑاس نکال لیتا۔ چنانچہ اسی طرح چند مرتبہ میں نے اس نظم کو دہرایا اور چونکہ وقت زیادہ گزر گیا تھا۔ قلم اٹھا کر بے ساختہ خط کا جواب لکھنا شروع کر دیا۔ لکھتے لکھتے ایک مقام پر پھر قلب کی وہی کیفیت ہو گئی۔ اور چند منٹ تک قلم رکا رہا۔ وہ وقفہ کیسا تھا۔ اور کیوں تھا؟ اس کا پورا جواب تو اب ناممکن ہے۔ کیونکہ نہ وہ وقت اب واپس آ سکتا ہے۔ اور نہ ہی وہ کیفیت قلم لکھ سکتا ہے۔ نہائت ہی مجمل سا بیان یہ ہے۔ کہ میں اس آواز کے جواب میں جو مجھے خدا کے نام پر دی گئی تھی لبیک کہنا چاہتا تھا۔ مگر دل اس کٹھن گھاٹی کے مشکلات کا خیال کر کے کانپنے اور لرزہ کھانے لگتا۔ اور ہاتھ رُک جاتا تھا۔ اور یہ ایک ایسی کشمکش اور گرداب تھا۔ کہ جس میں سے میں اپنی طاقت اور سمجھ یا قوتِ بازو سے نکل سکنے کے قابل نہ تھا۔

آخر میں پھر رو دیا اور گڑگڑایا۔ اور خدا سے امداد کا طالب اور راہنمائی کا ملتجی ہؤا جس کے نتیجہ میں خدا نے محض اپنے فضل سے میرے دل کو سکون اور اطمینان اور ہاتھ کو قوت بخشی اور میں نے غیر مشروط الفاظ میں مکرم سید بشیر حیدر صاحب کی خدمت میں اُن کے خط کے جواب میں لکھ دیا۔ کہ

"میں پندرہ روز کے اندر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اس میں تخلف ہرگز نہ ہوگا۔ اور اگر میں اس عرصہ میں نہ پہنچوں۔ تو آپ یقین کر لینا۔ کہ ہرشچندر دنیا کے پردے پر زندہ موجود نہیں"۔ بس۔ والسلام

میں نے یہ لکھا اور اس قوت اور اطمینان سے لکھا۔ کہ میرے دل میں کسی قسم کا تذبذب پیدا ہؤا نہ گھبراہٹ و خوف بلکہ ایک تسکین تھی جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی جس سے گویا میرے دل پر سے بوجھ کے پہاڑ اُتر گئے اور میں ہلکا پھلکا ہو گیا۔

میں نہ جانتا تھا۔ کہ "پندرہ روز" کا وعدہ میں نے کس اُمید پر اور خیال پر کیا ہے اور نہ ہی میرے دل میں

کوئی سکیم اور پروگرام تھا۔ جس کا نقشہ میں نے دل میں مرتب کر لیا تھا۔ وہ محض ایک فقرہ تھا۔ جو بے ساختہ لکھا گیا۔ اور ایک جملہ تھا جس کی تفصیل و کیفیت اس وقت میرے ذہن میں ہرگز ہرگز نہ تھی۔ کیونکہ میں نے سوچ سمجھ کر نہ لکھا تھا۔ اور خود بھی نہ لکھا تھا۔ بلکہ وہ مجھ سے لکھوا دیا گیا تھا۔

الغرض خط کا جواب لکھا گیا۔ جسے لفافہ میں بند کر کے گاؤں کو لوٹا۔ ڈاک کے ہرکارہ کی تلاش کی۔ اور وہ لفافہ چند پیسے انعام کے ساتھ اس کے حوالے کر کے فارغ ہؤا۔

خط ہرکارے کو دیکر اور پھر اُس کے بعد بھی میں مطمئن تھا۔ خوش تھا۔ اور کوئی گھبراہٹ میرے دل میں نہ تھی کہ کیوں میں نے ایسا کام کیا۔ جس کا پورا کرنا میری طاقت میں نہیں۔ اور جس کے عدم ایفاء کا نتیجہ موت ہے۔ دل میں یہی تھا۔ کہ جو ہؤا ٹھیک ہؤا۔ اور ہونا تھا جو ہو گیا۔ اب ڈر اور خوف کی گنجائش ہی باقی نہیں۔

خط تھا۔ لکھا بھی گیا۔ اور چلا بھی گیا۔ مگر اُس میں مندرجہ وعدہ کے ایفاء کا کوئی سامان...... بجز ایک وہم اور جنون تھا۔ نہ صرف یہی تھا۔ کہ سامان کوئی نہ تھا۔ بلکہ اس کی مخالفت خود میرے والدین فرما رہے تھے۔ اور اپنی ساری توجہ اور پورا زور اس بات پر خرچ کر رہے تھے۔ کہ کسی طرح میرے دل سے باہر جانے کے خیال کو بالکل ہی نکال دیں۔ چنانچہ کبھی کبھی میں نے بیکاری کا شکوہ کر کے عرض کی۔ تو مجھے کبھی محبت اور نرمی سے اور کبھی ناراضگی اور خفگی سے یہی جواب ملا کہ یہ خیال دل سے نکال دو ہمیں نوکری کی ضرورت نہیں گھر میں پرماتما نے بہت کچھ دے رکھا ہے اس کو سنبھالو۔ اور بھائی بہنوں کے ساتھ ملکر خوشی سے کھاؤ پیؤ۔ اور اگر کام کا بہت ہی شوق ہے۔ تو ہمارے کام میں ہماری مدد کرو۔ وغیرہ

میں والد صاحب کے کام میں مدد بھی کیا کرتا۔ گرداوری اور پیمائش بازگشت وغیرہ کرا آتا تھا۔ مگر بعض باتوں میں میں اُن کے خیال کے مطابق اُن کا نقصان بھی کیا کرتا تھا۔ جس سے وہ کبھی کبھی کبیدہ خاطر ہو کر فرمایا کرتے۔ کہ "اس لڑکے کو گھر کے نفع نقصان کی بھی سمجھ نہیں۔" اور یہ شکایت یوں پیدا ہوتی تھی۔ کہ میں تو خیر کسی کو پکڑتا ہی نہ کرتا۔ مگر بعض اوقات ایسا بھی ہوتا۔ کہ والد صاحب گشت میں جاتے۔ تو لوگوں کے مویشی وغیرہ گھیر کر لے آتے۔ اُن سے بھاری رقم جرمانہ وغیرہ وصول کیا کرتے تھے۔ مجھے موقعہ لگ جاتا تو میں کسی نہ کسی طرح والد صاحب کو ٹالنے کی کوشش کرتا۔ یا اگر والد صاحب انہیں چھوڑ کر ادھر اُدھر ہوتے۔ تو اُن کو چھوڑ یا بھگا دیا کرتا تھا۔ کیونکہ میں ان باتوں کو اکثر حالات میں ظلم اور زیادتی کی حد تک بڑھا ہؤا پاتا تھا۔

دن ایک ایک کر کے گذرنا شروع ہوئے۔ اور جوں جوں وہ گذرتے میری بیقراری اور اضطراب بڑھتا جاتا۔ اور بے چینی سے کبھی صحن میں کبھی چھت پر بیٹھا پُرسوز اور رقت آمیز لہجہ میں بعض دردناک نقرے بولا کرتا۔ یا وہی "دلا غافل نہ ہو یکدم کہ دنیا چھوڑ جانا ہے"۔ کی صدائیں کرتا رہتا۔

آنیوالی خیالی مصیبت کے خیال کا دل پر گہرا اثر تھا۔ جس کی وجہ سے خوشی آہستہ آہستہ دل سے نکلتی جا رہی تھی اور اس کی بجائے غم و الم اور اُداسی و افسردگی جگہ لے رہے تھے مجھے کھانے سے رغبت رہی۔ نہ پینے کا شوق باقی رہا۔ گھر میں دودھ دہی کی افراط تھی۔ جس کا میں بچپن سے شوقین تھا۔ مگر اب باوجود والدہ صاحبہ کے تقاضا کے میں نہ پیتا۔ مرغ میں نے بکثرت جمع کر رکھے تھے۔ اُن کی داشت سنبھال کا بھی قصہ چک گیا۔ اور کتے بلی کا وہ شکار ہونے لگے۔ رات کو مجھے چین نہ آتا اور کروٹ لیتے یا ستارے گنتے کٹنے لگی۔ اور ان باتوں کا اثر میری جسمانی صحت پر بھی پڑنے لگا۔ اور میرے دلی درد کی ترجمانی میرا چہرہ اور باقی اعضاء کرنے لگ گئے۔

والدہ محترمہ چونکہ گھر میں ہوتیں۔ میری حرکات اور بیقراری و بےتابی کا معائنہ فرمایا کرتیں۔ اور چونکہ وہ عورت ذات تھیں۔ اُن کا دل فطرتاً نرم تھا۔ میرے اِن حالات کا ان کے دل پر اثر ہوتا۔ اور کبھی کبھی وہ والد صاحب کو میرے متعلق فرمایا کرتیں

"اسے کیا ہو گیا ہے۔ یہ تو دن بدن کمزور ہوتا جاتا ہے کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ بلکہ دن رات رو رو کر کچھ پڑھتا رہتا ہے۔ اسے جہاں کہتا ہے کیوں نہ بھیجدیں۔"

مگر والد صاحب توجہ نہ فرماتے۔ اور بات کو ٹال دیا کرتے۔ ہوتے ہوتے ایک ہفتہ گذر گیا۔ آٹھ۔ نو۔ دس۔ گیارہ بارہ بلکہ تیرہ دن گذر گئے۔ مگر میری مشکلکشائی کا کوئی سامان نظر نہ آیا۔ دن چڑھا مگر میرا دل بیٹھا ہؤا تھا۔ گھر والوں نے ناشتہ کیا۔ اور کھانا پکایا۔ مگر مجھے اِن چیزوں سے نفرت تھی۔ کیونکہ آجکا دن میرے وعدہ پہ پہنچ سکنے کا آخری دن تھا۔ زمین و آسمان میرے واسطے اندھیر تھے۔ اور اب مجھے دنیا کی کسی چیز سے وابستگی باقی نہ رہی تھی۔

میں آج کسی خاص خیال سے بالکل ہی نرالے رنگ کے گیت گایا کیا۔ جن کو میرے سوا یا میرے خدا کے بغیر کوئی سمجھ بھی نہ سکتا تھا۔ اور آج میں اپنے خیال میں اپنے خدا سے بھی آخری ہی عرض معروض کر رہا تھا۔ دن چڑھا۔ دوپہر ہوئی۔ دن ڈھلا اور پھر شام ہوئی۔ اور شام کے ساتھ ہی مجھے اپنی زندگی کی بھی شام نظر آنے لگی۔ اور مجھ پر انتہائی اضطراب بے قراری اور بے چینی مسلط ہو گئی۔ اور ایسا ہؤا۔ کہ مایوسی کا غلبہ ہو گیا۔ اور میں سرِ شام ہی چھت پر جا کر لیٹ گیا۔

مجھے لیٹے ابھی چند ہی منٹ ہوئے ہونگے۔ کہ میرے کان میں والد صاحب کی آواز پڑی جن کے ساتھ مجھے ایسا معلوم ہؤا کہ کوئی اجنبی گھوڑا گھوڑی ہے۔ والد صاحب نے گھوڑی کو باہر چھوڑا۔ اور اندر تشریف لائے۔ والدہ صاحبہ نے اس گھوڑی کے متعلق پوچھا کس کی ہے۔ اور کیوں آئی ہے؟ میں بھی کان لگا کر والدین کی باتوں کو سننے کی کوشش کی۔ اور میری خوشی کی کوئی انتہا باقی نہ رہی۔ جب میرے کان میں یہ آواز پڑی کہ گھوڑی لایا ہوں۔

"تمہارے پلوٹھے کو نوکری کے واسطے بھیجنے کی غرض سے اور بروالا بھی بلایا ہے۔ اس کے واسطے روٹی ووٹی پکاؤ۔ تا رات ہی کو بھیجدیں۔ کیونکہ گرمی کا موسم ہے۔ دن میں سفر نہ ہو سکیگا۔ راستہ میں پانی بھی نہیں ملتا۔ وغیرہ"

میں یہ خبر سنکر اچھل پڑا۔ نیچے اُتر آیا۔ اور تجاہل عارفانہ کے طریق پر والد صاحب سے گھوڑی کے متعلق پوچھنے لگا۔ جس کے جواب میں والد صاحب نے مجھے بھی وہی کچھ فرمایا۔ جو والدہ صاحبہ سے کہا تھا۔ اور فرمایا۔ کہ ایک دو جوڑے کپڑوں کے اور مختصر سا بستر ساتھ لے لینا۔ کیونکہ گھوڑی پر زیادہ بوجھ نہ بندھ سکے گا۔

قربان جاؤں میں اپنے قادر مطلق خدا کے جو حقیقۃً مقلب القلوب اور نہاں در نہاں خیالات پر بھی تصرف رکھتا ہے۔ اور جس کے اذن کے بغیر کوئی ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا اور سچ مچ وہی پاک ذات کُن فیکون کا مالک ہے۔ مایوسی اور ناامیدی میں وہ بے سہاروں کا سہارا اور ناامیدوں کی امید بنتا۔ اور مضطر کی التجا کو سنتا اور غیر ممکن کو ممکن میں بدل دیتا ہے۔

میرے وہم میں بھی کوئی بات نہیں آسکتی۔ اور ڈھونڈ کر بھی میں وہ اسباب نہیں معلوم کر سکتا۔ جن کے نتیجہ میں میرے والد صاحب کے دل پر ایسا تصرف ہؤا۔ کہ کل تک جس بات سے وہ باوجود درخواستوں کے انکار اور انکار پر اصرار کرتے تھے۔ آج کس وجہ سے خود بخود اس کے لئے سامان کر لائے۔ کس چیز نے اُن کے دل کو پھیرا؟ وہ صرف اور صرف خدائے واحد و یگانہ کی قدرت کا ایک کرشمہ تھا۔ ورنہ اور کوئی سامان اس کے لئے ہرگز ہرگز موجود نہ تھے والدہ محترمہ نے جلد جلد کچھ میٹھی روٹیاں۔ حلوہ اور انڈے تیار کئے اور میں جو پہلے ہی کمربستہ تھا۔ جلدی جلدی کپڑے سمیٹ بستر باندھ تیار ہو گیا۔ بروالے کے آنے میں کچھ دیر ہوئی۔ اتنے میں میں اپنے بھائی بہنوں کو ایک ایک کر کے گلے لگا کر پیار کرنے لگا۔ اور ایسا ہؤا۔ کہ میرا دل اُن خیالات کی وجہ سے جو میرے دل میں موجزن تھے بھر گیا۔ جدائی بلکہ دائمی جدائی کے خیال سے میں ایسا متاثر ہؤا۔ کہ ضبط نہ کر سکا۔ اور باوجود اس خطرہ کے کہ اسوقت کی بے صبری نہ معلوم کیا بنا دیگی۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اور گھر میں ایسا کہرام مچا۔ کہ گاؤں والے گھبرا کر خیریت پوچھنے کو دوڑے بروالے نے آواز دی۔ اور میں دل کو تھام کر روتے ہوئے بھائی بہنوں اور غمگین ماں باپ کو خدا کے لئے گویا ہمیشہ کے واسطے چھوڑ کر گھر سے نکل کھڑا ہؤا۔ تھوڑی دور تک جا کر والد صاحب اور چھوٹے بھائی نے الوداع کہی وہ واپس لوٹے اور میں جلد جلد اپنا سفر کاٹنے لگا چلتے چلاتے رات کے بارہ بج چکے ہونگے۔ اور یہ رات پانچ اور چھ جون ۱۸۹۵ء کی درمیانی رات تھی۔ جب میں گھر سے خدا کی رضا اور اس کے دین کی تلاش میں نکلا۔ اور سات جون کا دن وہ آخری دن تھا۔ جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے میری قلم سے میرے ایک حقیقی دوست کے نام لکھوایا ہؤا تھا۔